اقبالیات (اردو)

جولائی تا ستمبر، ۱۹۶۷ء

مدیر:

بشیر احمد ڈار

اقبال اکادمی پاکستان

عنوان	:	اقبالیات (جولائی تا ستمبر، ۱۹۶۷ء)
مدیر	:	بشیر احمد ڈار
پبلشرز	:	اقبال اکادمی پاکستان
شہر	:	کراچی
سال	:	۱۹۶۷ء
درجہ بندی (ڈی۔ڈی۔سی)	:	۱۰۵
درجہ بندی (اقبال اکادمی پاکستان)	:	8U1.66V11
صفحات	:	۱۰۳
سائز	:	۵ء۲۴×۵ء۱۴س م
آئی۔ایس۔ایس۔این	:	۰۰۲۱-۰۷۷۳
موضوعات	:	اقبالیات
	:	فلسفہ
	:	تحقیق

IQBAL CYBER LIBRARY

(www.iqbalcyberlibrary.net)

Iqbal Academy Pakistan

(www.iap.gov.pk)

6th Floor Aiwan-e-Iqbal Complex, Egerton Road, Lahore.

مندرجات

جلد: ۸ | اقبالیات: جولائی تا ستمبر، ۱۹۶۷ء | شمارہ: ۲

اقبال ریویو

مجلۂ اقبال اکادمی، پاکستان

جولائی ۱۹۶۷

مندرجات

اقبال اکادمی پاکستان، کراچی

اقبال ریویو

مجلۂ اقبال اکادمی ، پاکستان

یہ رسالہ اقبال کی زندگی ، شاعری اور فکر پر علمی تحقیق کے لیے وقف ہے اور اس میں علوم و فنون کے ان تمام شعبہ جات کا تنقیدی مطالعہ شائع ہوتا ہے جن سے انھیں دلچسپی تھی ، مثلاً اسلامیات ، فلسفہ ، تاریخ ، عمرانیات ، مذہب ، ادب ، فن ، آثاریات ، وغیرہ ۔

بدل اشتراک

(چار شماروں کے لیے)

پاکستان	بیرونی ممالک
۱۲ روپیہ	۳۰ شلنگ یا ۴ ڈالر

قیمت فی شمارہ

پاکستان	بیرونی ممالک
۳ روپے	۸ شلنگ یا ۱ ڈالر

مضامین برائے اشاعت

مدیر ''اقبال ریویو'' ۴۳—۶/ڈی ، بلاک نمبر ۶ ، پی - ای - سی - ایچ - سوسائٹی ، کراچی—۲۹ کے پتہ پر ارسال فرماویں ۔ اکادمی کسی مضمون کی گمشدگی کی کسی طرح بھی ذمہ دار نہ ہوگی ۔ اگر کسی مضمون کے ہمراہ ٹکٹ نہ بھیجے جائیں تو اسے واپس نہیں کیا جاتا ۔

ناشر و طابع : بی ۔ اے ۔ ڈار ، ڈائرکٹر ، اقبال اکادمی ، پاکستان ، کراچی
مطبع : ٹکنیکل پرنٹرز ، کراچی ، ۔ طابع محمد کرامت اللہ عثمانی

٦

اقبال ریویو

مجلہ اقبال اکادمی پاکستان

مدیر : بی ۔ اے ۔ ڈار　　　مدیر معاون : اے ۔ ایچ ۔ کمالی

جلد ۸　　　جولائی ۱۹۶۷ مطابق ربیع الاول ۱۳۸۷　　　شمارہ ۲

مندرجات

B

اس شمارے کے مضمون نگار

* شیخ احمد رفاعی ، ایک بلند پایہ صوفی ، سلسلۂ رفاعیہ کے بانی

* مشفق خواجہ ، مدیر ''قومی زبان'' کراچی
نائب معتمد انجمن ترقی اردو ، کراچی

* لفٹیننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید ، ڈائرکٹر جناح پوسٹ گریجویٹ میڈیکل سینٹر ، کراچی

* خواجہ عبدالوحید ، ایک معروف عالم اور مصنف '' کتابیات اقبال'' (انگریزی)

* محمد شفیع (م ۔ ش) ، اقبال کے آخری ایام کے رفیق ، مدیر ''اقدام''

الحکم الرفاعیہ

شیخ احمد رفاعی

یہ رسالہ سید احمد کبیر رفاعی کی تصنیف ہے ، جو عربی میں لکھا گیا ، اس کا فارسی ترجمہ قسطنطنیہ میں چھپا تھا ۔ جس کا اردو ترجمہ مولانا عبدالحلیم شرر نے کیا تھا ، موجودہ متن ۱۹۱۶ع میں دلگداز پریس لکھنؤ سے شائع ہوا تھا ۔

اقبال رموز بے خودی میں سید احمد کبیر کے متعلق فرماتے ہیں :

شیخ احمد سید گردوں جناب کا سب نور از ضمیرش آفتاب
گل کہ می پوشد مزار پاک او لا الہ گویاں دمد از خاک او
با مریدے گفت اے جان پدر از خیالات عجم باید حذر
زاں کہ فکرش گرچہ از گردوں گزشت از حد دین نبی بیروں گزشت

یہ خیالات اس رسالے میں شیخ نے عبدالسمیع ہاشمی کو مخاطب کرتے ہوئے یوں ظاہر کیے ہیں : ''خبردار اہل عجم کی زیادتیوں سے دھوکا نہ کھانا ، اس لیے کہ ان میں سے بعض حد سے گزر گئے ہیں ۔''

سید احمد کبیر رفاعی نسباً موسوی حسینی تھے ، یعنی امام موسیٰ کاظم کی اولاد میں سے تھے ۔ ان کے اجداد میں ایک شخص سید حسن مکی معروف بہ سلطان مہدی تھے ، جن کا لقب ''رفاعہ'' تھا ۔ رفاعہ کے لغوی معنی ''آواز کا بلند ہونا'' ہے اور اسی بنا پر ان کو رفاعی کہا جانے لگا ۔ ان کے بزرگ مکہ معظمہ میں مقیم تھے ، سید احمد کبیر کے والد مکہ سے نکل کر عراق کے زیریں علاقے یعنی بطائح شط العرب کے ایک جزیرہ نما قریہ ''ام عبیدہ'' میں مقیم ہو گئے ؛ یہیں آپ کی پیدائش ۵۰۰ھ/۱۱۰۶–۱۱۰۷ع میں ہوئی اور ۲۲ جمادی الاول ۵۷۸/ ۳ اکتوبر ۱۱۸۱ع میں آپ نے وفات پائی ، ان کا سلسلۂ طریقت حضرت جنید سے ملتا ہے ۔[1] مجالس الاحمدیہ ، آثار النافعہ ، الحکم الساطعہ ، البرہان المؤلد آپ کی چند دیگر تصانیف ہیں ، جن میں سے آخر الذکر کتاب کا اردو ترجمہ بھی بنیان المشیّد کے نام سے چھپ چکا ہے ۔

۱- یہ حالات حضرت شاہ غلام حسنین صاحبؒ پھلواروی کے مضمون ''سلسلہ رفاعیہ پر ایک نظر'' مطبوعہ ''منادی'' (اگست ۱۹۵۸ع) سے لیے گئے ہیں ، جس کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں ۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین ۔ وصلی اللہ وسلم علیٰ سیدنا محمد و آلہ و اصحابہ اجمعین ۔ و السلام علینا و علیٰ عباداللہ الصالحین ۔ از جانب بندۂ فقیر ہیچمیرز آحیمد (چھوٹا غالباً انکساراً حضرت قطب علامہ نے تصغیر کا صیغہ استعمال فرمایا ہے) بنام شیخ محتشم ہاشمی خدا ہمارے اُن کے اور تمام مسلمانوں کے حال پر مہربان رہے ۔ آمین !

بھائی میں تمھیں وصیت کرتا ہوں کہ اللہ جل شانہٗ سے ڈرتے رہو اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرو ۔ اور یہ چاہتا ہوں کہ اس نصیحت کو جو تمھارے حق میں اور اُن لوگوں کے حق میں جو تمھارے مثل ہوں ، بخوبی مفید ثابت ہوگی ۔ پورے شوق سے قبول کرو اور خبردار ! وہ شخص جو اس کی اہلیت نہ رکھتا ہو ، اس سے بہرہ یاب نہ ہو ۔ اس لیے کہ اگر اس بارے میں تم نے بے احتیاطی کی تو تم اس نصیحت کے اوپر ظلم کرو گے ۔

اے عبدالسمیع ! فقیر اگر اپنے نفس کے ساتھ دوستی کرتا ہے تو نہایت ہی تھک جاتا ہے ، لیکن اگر اپنا کام خدا کے سپرد کر دیتا ہے تو خدا بغیر عزیزوں اور دوستوں کی وساطت کے اُس کی دستگیری کرتا ہے ۔ عقل فائدوں کا خزانہ اور خوش نصیبی کی کیمیا ہے ، علم دنیا میں شرافت ہے اور آخرت میں عزت ۔ جو شخص اس مستعار زندگی میں اٹکا رہتا ہے ، اُسے سوا حجابوں کے اور کوئی نفع نہیں حاصل ہوتا ۔ ماں کا رونا کرائے کی رونے والیوں کا رونا نہیں ہے ، انسان جس قدر لوگوں کے آس پاس جوتیاں چٹخاتا ہے ، اُسی قدر رمز وحدت اور دین‌داری کو ہاتھ سے دیتا جاتا ہے ۔ دو چیزیں دین میں ترقی دلاتی ہیں ، ایک تنہائی میں ذکر کرنا اور دوسرے نعمت الٰہی کا حد سے زیادہ تذکرہ کرنا۔ انسان کی حالت اُس کے دوستوں اور ہم صحبتوں کے دیکھنے سے معلوم ہو جاتی ہے ۔ لوگ جو سختیاں برداشت کرتے اور کم و زیادہ کی فکر میں رہتے ہیں، یہ سب حکومت اور شہوت کی بدولت ہے اور یہی دو چیزیں لوگوں کا مقصود ہیں ۔

جو حقیقت شریعت سے جدا ہو وہ زندقہ ہے ، معرفت خداوندی کی انتہا یہ ہے کہ بغیر چون و چرا کے اور بغیر کسی مقام و جگہ کے ساتھ خدا کی تخصیص کیے اُس کی ہستی کا یقین ہو جائے ، جن لوگوں کی نگاہ کے سامنے سے پردہ نہیں ہٹا ہے ، اُن کے نزدیک مرض موت کی شدت کا زمانہ معرفت الٰہی کی پہلی گھڑیاں

ہیں اور اسی لیے ہم سے کہا گیا ہے : ''موتوا قبل ان تموتوا'' (مرنے سے پہلے مر جاؤ) موت آتے ہی پردہ اٹھا دیتی ہے ۔ چنان چہ وارد ہوا ہے : ''الناس نیام فاذا ماتوا انتبھو ۔'' (لوگ سو رہے ہیں ۔ لہٰذا جب مرتے ہیں تب ہوشیار ہوتے ہیں) ۔ اللہ جل شانہ کو تمام صفات سے منزہ کرنے سے پہلے تمھاری ساری توحید شرک ہے ، توحید انسان کے دل میں ایک وجدانی چیز ہے جو اُسے نیز خدا کے معطل کرنے سے (یعنی اُس کے تمام صفات کے سلب کرنے سے) روکتی ہے اور نیز تشبیہ (یعنی اُس ذات ایزدی کو کسی کے مثل سمجھنے) سے روکتی ہے ، یہ آنا جانا سب خیال ہی خیال ہے ۔

اے محتاج شخص ! غرور کے گھوڑے سے اتر کے پیادہ ہو ، بہت سی ایسی لغزشیں ہیں جو گڑھے میں پھینک دیتی ہیں ۔ بعض علم ایسے ہیں کہ اُن کا پھل جہالت ہے اور بعض جہالتیں ایسی ہیں جن کا پھل علم ہے ُتو نے تو اپنے علم کو ذلت کا جامہ پہنا دیا ہے ۔ پھر علم کی عزت تجھے کیوں کر حاصل ہو ۔ یہ نہ سمجھ کہ مہندی کا رنگ تیرے بڑھاپے کو چھپا دے گا ، اس لیے کہ مہندی نے تیرے بالوں کا رنگ بدلا ہے ۔ تیرے بڑھاپے کو نہیں بدلا ہے ۔ آدمی کا ایک جگہ جم کر بیٹھنا قاف سے قاف تک پھرنے سے افضل ہے اور حضرت حق سبحانہ و تعالیٰ کی ذات و صفات میں گفتگو کرنے سے خاموشی زیادہ کمال رکھتی ہے جو شخص خدا کی مخلوق پر دست درازی کرتا ہے خدا کے نزدیک اُس کا ہاتھ چھوٹا ہوتا ہے اور جو خدا کے بندوں کے مقابل غرور کرتا ہے ، وہ اُس معبود برحق کی نظر سے گر جاتا ہے ، ہر حالت بدل جانے والی ہے اور ہر چھپی ہوئی چیز کا ایک ظاہری رخ ہے ۔ جس نے تحمل کی زرہ پہن لی ، وہ عجلت کے تیر سے بچ گیا ۔ کوئی زبردست آدمی زمین کے کسی سبب سے اونچے پہاڑ پر نیزہ گاڑ دے ، تو اگر آٹھ روز تک رات دن آندھی چلتی رہے تو بھی اُس کا بال بیکا نہیں ہو سکتا ۔ جھوٹا وہ ہے جس کی بنیاد بدعتوں پر ہے اور عقلمند وہ ہے جو بدعات سے پاک ہو ۔ انسان کامل خدا کے سوا ہر چیز کو ترک کر دیتا ہے ۔ مخلوقات میں جتنے ہیں ، وہ نہ نقصان پہونچا سکتے ہیں اور نہ فائدہ ۔ بلکہ خدا کے بندوں کے سامنے حجاب بنے ہوئے ہیں ۔ اس حجاب کو جو اُٹھا دیتا ہے وہ اپنے خالق تک جا پہونچتا ہے ۔ خدا کے سوا کسی اور چیز پر بھروسہ کر لینا ہی خوف ہے اور خدا کا خوف دوسروں کی طرف سے بے خوف کر دیتا ہے ۔ ہر حالت کے نیچے ایک حالت ربوبیت موجود ہے ۔ اگر ُتو اُسے پہچانتا ہوتا تو جانتا کہ تیرا ہاتھ پاؤں مارنا اور تیرا سکون دونوں اُسی سے علاقہ رکھتے ہیں اور تجھ پر وہ مسلط ہے ۔ ''اعملوا فکل میسر لما خلق لہ'' (کام کیے جاؤ اس لیے کہ ہر شخص کو

جو معرفت کے لیے ہمیشہ متنبہ رہے، وہ سر ہے جس میں سلامت روی ہو۔ وہ دل ہے، جس میں رحم ہو اور وہ قدم ہے، جو حق کے راستے پر قائم ہو۔ حکمت کے لیے شرط ہے کہ خیرات کو تو اُن لوگوں تک پہونچا دے جو اُس کے مستحق ہیں اور سچائی کے لیے شرط ہے کہ غیر مستحقین پر بھی ُتو ہاتھ نہ روکے اور ان دونوں کاموں کا پھل ُتو خدا سے پائے گا۔ جو نعمتیں تجھ کو ملی ہیں اُن کی ناشکری نہ کر۔ اس لیے کہ یہ خدا کو ناگوار ہے، جس کے دل میں فریب ہو اُس کے لیے فلاحیت نہیں ہے۔ ظالم عزیز نہیں ہوتا۔ گنہگار کا کام پورا نہیں اور جو بندہ صرف خدا کی وکالت اور اسی کی مدد پر قناعت کرتا ہے، ذلیل نہیں ہوتا ہے۔ جس شخص کے دل میں شک ہے اُسے فلاح نہیں ہوتی۔ مکار کی آرزو نہیں پوری ہوتی، کنجوس کو فائدہ نہیں ہوتا، حاسد کو کسی کی مدد نہیں ملتی اور سگ دنیا مردار گوشت پر پورا قابو نہیں پاتا۔

وہ بندۂ مومن جو خداوند تعالیٰ کے سوا کوئی مددگار نہیں رکھتا، اُس کا دل توڑنے کی کوشش میں مملکت کسریٰ بھی درہم و برہم ہو جاتی ہے۔ جو لوگ اپنے نفس کو دیکھا کرتے ہیں، اُن کا دل اندھا ہو جاتا ہے۔ دین دار آدمی توبہ و استغفار کے ذریعہ سے حجاب کو اپنے سامنے سے ہٹا دیتا ہے اور بے دین کی آنکھوں پر پردے کے بعد پردے پڑتے رہتے ہیں اور معصوم وہ ہے جس کی خدا تعالیٰ نے نگہبانی کی۔ بے وقوفی کا کوئی علاج نہیں ہے اور حماقت کا مرض دور نہیں ہوتا۔ مغرور کے ساتھ کوئی ہم صحبت نہیں ہوتا اور دغا باز عہد و پیمان کا پاس و لحاظ نہیں کرتا، جو غافل ہے اُسے نور نہیں عطا ہوا ہے، جو شخص اپنے قول و اقرار کو پورا نہیں کرتا، اُس کے پاس ایمان ہی نہیں ہے۔

خداوند تعالیٰ نے مقرر فرما دیا ہے کہ نیکوکار بندے شریروں کے ہاتھوں اور بدکاروں کی زبانوں سے اس دنیا میں سخت تکلیف اُٹھائیں اور حقیر و مردار شخص بھی نیکی کرنے والے کے حق میں بدی اور بے ضرر آدمی کے ساتھ مکر و فریب کرے۔ خدا کی مدد صاحب خلوص اور منکسر المزاج بندوں کو گھیرے ہوئے ہے۔ ''و ما للظالمین من انصار'' (اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہے) دشمن کی پہچان یہ ہے کہ تیری دولت کی طرف راغب ہو، مگر جب تیری دولت کو نقصان پہونچ جائے تو تجھے چھوڑ دے۔ تیری پیٹھ کے پیچھے تجھ پر زبان کی تلوار سے حملے کرے اور تیری ثنا و صفت کرنی اُسے ناگوار گزرے، تو اُسے خدا پر چھوڑ دے۔ اس لیے کہ وہ خود ہی اوندھے منہ گرے گا۔ اُس کی مثال آگ سی ہے کہ لکڑی کو کھاتی ہے اور اُس کے ساتھ خود بھی فنا ہو جاتی ہے۔ وکفیٰ باللہ نصیرا۔ (اور مددگار چاہیے تو اللہ کافی ہے) اور دوست کی علامت یہ

ژبردستی کی قوت سے لوگوں کو تابع کرتا ہے ، وہ اُس کا چاہے جو طرز عمل ہو، اُن کے دل میں اپنی دشمنی کی بنیاد قائم کرتا ہے اور جو شخص غریبی اور تواضع سے لوگوں کو اپنے بس میں کرتا ہے ، وہ اُن کے دل میں اپنی عزت کا نقش قائم کرتا ہے ۔ خدا کے ملک میں سب سے اچھا رفیق خوف خدا ہے اور سب سے اچھی شوکت اخلاص ہے ۔ جس شخص میں تھوڑی سی نخوت و انانیت بھی ہو وہ اہل کمال کے مرتبے کو ہرگز نہیں پہونچ سکتا ہے ۔ خدا کی نعمتوں کو یاد کرنے والا اگر مرتبے سے گر جائے تو بھی شکرگزاری کے راستے سے نہیں ہٹتا جو شخص کامل ہے وہ اپنی خدمت سے باز نہیں آتا ۔ کسی چیز کا دعویٰ کرنا نفس انسانی میں نخوت کا باقی ماندہ حصہ ہے ۔ اگرچہ دل بار نہیں اُٹھا سکتا ، مگر احمق اس قسم کے دعوے سے باز نہیں آتا ۔ نعمت الٰہی کا ذکرکرنا اُس کی قربت کا بیان کرنا ہے اور اُس کے ذکر میں کوتاہی کرنا بندہ ہونے کے درجے سے تجاوز کرنا ہے جو عارف ہے اُس کی نظر نہ دنیا پر پڑتی ہے اور نہ آخرت پر ۔ سب سے بہتر کمال یہ ہے کہ غیروں کو چھوڑ دے ۔ تغیرات عالم سے بشارت حاصل کرے اور اپنے آپ کو اُس زندۂ ازلی کے دست قدرت میں دے کے اپنے کو ذلیل بنائے اور فنا کا جامہ پہن لے ۔ شیخ کے مکان کو حرم ، اُس کی قبر کو صنم اور اُس کے حالات کو آلات معرفت قرار دے کے دین کو برہم نہ کر ۔ انسان وہ ہے جس پر پیر کو فخر و ناز ہو ، نہ وہ جو پیر پر فخر کرے ۔ جس کسی کا کان ماسوای اللہ کی آواز سے بہرہ ہو گیا ہے وہ ''لمن الملک الیوم''[۱] کی صدا سنتا ہے ۔ ایسا شخص جھوٹ غرور ، انانیت ، طاقت ، جوش اور غضب کے گھوڑے سے اُترتا ہے اور عبدیت کے مقام میں ٹھہرتا ہے ۔ اُس کلام کے پاس ہرگز نہ جانا جسے بعض صوفی وحدت الٰہی کے بارے میں زبان سے نکالتے ہیں اور نعمت ہائے ربانی کے اعتراف و اقرار میں ہرگز کوتاہی نہ کرنا ۔ اس لیے کہ گناہوں کا پردہ کفران نعمت کے پردے سے پھر غنیمت ہے ۔ ''ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ و یغفر ما دون ذالک لمن یشاء''(اللہ اس چیز کو نہیں معاف کرتا کہ اُس کی درگاہ میں شرک کیا جائے اور اس کے علاوہ جس کسی کو چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے) کسی شخص کو اگر تو ہوا میں اُڑتے دیکھے تو بھی جب تک تُو اُس کے اقول و افعال کو شرع کی ترازو میں نہ تول لے ، اُس کا اعتبار نہ کر اور گروہ صوفیہ کے ہر قول و فعل سے خبردار ، انکار نہ کرنا ۔ اُن کے حالات کو تو اُنھیں پر چھوڑ دے ۔ اگر شرع شریف اُن کے معاملات میں مخالف نظر آئے تو تُو ایسی صورت میں پابند شرع رہ ۔

۱۔ ''لمن الملک الیوم'' یعنی آج کس کی بادشاہی ہے ؟ یہ وہ کلمہ ہے جسے میدان حشر میں حضرت رب العزت کی جانب سے سنیں گے ۔

مخلوقات کے ترک کرنے سے پہلے مسائل معرفت میں بحث کرنا بھی منجملہ خواہشات نفسانی کے ہے جو کوئی اپنی خواہش نفسانی کے باعث حق باطل کی طرف مائل ہو وہ گمراہی میں پڑا ہوا ہے ۔ معرفت الٰہی کے دروازوں میں سے پہلا دروازہ یہ ہے کہ انسان اپنے دل کو خدائے عز و جل سے مانوس کرے اور زہد خداوند جل و علا کی راہ میں چلنے والے کا پہلا قدم ہے ، جو عشق میں مرے وہ شہید ہے اور جو اپنی زندگی خلوص میں بسر کرتا ہے ، سعادت مند ہے اور یہ دونوں چیزیں جب ہی نصیب ہوتی ہیں جب خدا اُن کی توفیق دے ۔ جو شخص بغیر مرشد کے راستے میں چلتا ہے ، اُلٹے پاؤں واپس آتا ہے ۔ یہ طریقت ورثے میں نہیں ملتی ، نہ کوئی اُسے باپ کے ترکے میں پاتا ہے ۔ بلکہ اس طریقت کے حاصل کرنے کے لیے عمل و جہد ۔ حدود معینہ پر قائم رہنا ۔ اللہ جل شانہ کی درگاہ میں آنسو بہانا اور اُس حضرت رب العزت کا ادب کرنا ضروری ہے ۔ بہت سے نادان جانتے ہیں کہ یہ طریقہ، بحث و مباحثے ، روپے پیسے اور ظاہری اعمال کے ذریعے سے حاصل ہو جاتا ہے ۔ خدا کی قسم ایسا نہیں ہے ۔ بلکہ اس مرتبے کو انسان سچائی ، فروتنی ، ذلت ، فقیری ۔ سنت رسول مختار صلعم کی پیروی اور اغیار کے ترک کرنے سے پہونچتا ہے ۔

جس کا خدا عزیز ہو وہ ہر جگہ عزیز ہے اور جس کا اُس خدائے لم یزل کے سوا کوئی اور عزیز ہے ، وہ ہر جگہ عزیز نہیں ۔ قرآن ایسی نشانی ہے جس میں بہت سی نشانیاں جمع ہیں اور آیات ربانی اُس میں درج ہیں ۔ جس کسی پر خداوند جل و علا نے یہ احسان کیا ہے کہ اُس کے باطنی رموز کو سمجھتا اور ظاہری احکام شرع کی پابندی کرتا ہے اُسے دو برکتیں حاصل ہیں اور جو اپنی رائے سے معنی کہتا ہے ، گمراہ ہو جاتا ہے اور ظاہر و باطن دونوں سے دور جا پڑتا ہے ۔ خداوند جل و علا کا ذکر تمام آسمانی آفتوں سے دور ارضی حوادث کے لیے سپر ہے ۔ ذکر الٰہی کرنے والا شخص چونکہ خدا کا ہم صحبت ہے ، لہٰذا اُسے اُس رب العزت کے ادب سے در گزر نہ کرنا چاہیے تاکہ اُس صحبت سے دور نہ ہو جائے ، جو قبولیت کی برکت ہے اور غفلت سے پاک ہو جائے ۔ جو زبان کہ بارگاہ قلب کی سچی ترجمان ہے وہ اپنی دولت کو ظاہر کرتی اور اپنے خزانے کا دروازہ کھولتی ہے ۔ جس شخص کا دل پاک ہو اس کی زبان اچھی اور اُس کا بیان بھی شیریں ہے ، اگر اپنی زبان سے رموز حقیقت کے کھلنے کا اعتبار کرے اور اپنے قلب کو پاک کر دے تو اُس کو عرفان میں ترقی ہوتی ہے اور حجت حق اُس پر آشکارا ہوتی ہے اور جو صرف زبان کا حظ اُٹھا لینے پر کفایت کرکے افعال کے ثمروں کو چھوڑ دیتا ہے ، اُس کا ہاتھ اقوال ہی تک پہونچتا ہے ۔ روح وہ جسم ہے

جو معرفت کے لیے ہمیشہ متنبہ رہے، وہ سر ہے جس میں سلامت روی ہو۔ وہ دل ہے، جس میں رحم ہو اور وہ قدم ہے، جو حق کے راستے پر قائم ہو۔ حکمت کے لیے شرط ہے کہ خیرات کو تو اُن لوگوں تک پہونچا دے جو اُس کے مستحق ہیں اور سچائی کے لیے شرط ہے کہ غیر مستحقین پر بھی تُو ہاتھ نہ روکے اور ان دونوں کاموں کا پھل تُو خدا سے پائے گا۔ جو نعمتیں تجھ کو ملی ہیں اُن کی ناشکری نہ کر۔ اس لیے کہ یہ خدا کو ناگوار ہے، جس کے دل میں فریب ہو اُس کے لیے فلاحیت نہیں ہے۔ ظالم عزیز نہیں ہوتا۔ گنہگار کا کام پورا نہیں اور جو بندہ صرف خدا کی وکالت اور اسی کی مدد پر قناعت کرتا ہے، ذلیل نہیں ہوتا ہے۔ جس شخص کے دل میں شک ہے اُسے فلاح نہیں ہوتی۔ مکار کی آرزو نہیں پوری ہوتی، کنجوس کو فائدہ نہیں ہوتا، حاسد کو کسی کی مدد نہیں ملتی اور سگ دنیا مردار گوشت پر پورا قابو نہیں پاتا۔

وہ بندۂ مومن جو خداوند تعالیٰ کے سوا کوئی مددگار نہیں رکھتا، اُس کا دل توڑنے کی کوشش میں مملکت کسریٰ بھی درہم و برہم ہو جاتی ہے۔ جو لوگ اپنے نفس کو دیکھا کرتے ہیں، اُن کا دل اندھا ہو جاتا ہے۔ دین دار آدمی توبہ و استغفار کے ذریعہ سے حجاب کو اپنے سامنے سے ہٹا دیتا ہے اور بے دین کی آنکھوں پر پردے کے بعد پردے پڑتے رہتے ہیں اور معصوم وہ ہے جس کی خدا تعالیٰ نے نگہبانی کی۔ بے وقوفی کا کوئی علاج نہیں ہے اور حماقت کا مرض دور نہیں ہوتا۔ مغرور کے ساتھ کوئی ہم صحبت نہیں ہوتا اور دغا باز عہد و پیمان کا پاس و لحاظ نہیں کرتا، جو غافل ہے اُسے نور نہیں عطا ہوا ہے، جو شخص اپنے قول و اقرار کو پورا نہیں کرتا، اُس کے پاس ایمان ہی نہیں ہے۔

خداوند تعالیٰ نے مقرر فرما دیا ہے کہ نیکوکار بندے شریروں کے ہاتھوں اور بدکاروں کی زبانوں سے اس دنیا میں سخت تکلیف اُٹھائیں اور حقیر و مردار شخص بھی نیکی کرنے والے کے حق میں بدی اور بے ضرر آدمی کے ساتھ مکر و فریب کرے۔ خدا کی مدد صاحب خلوص اور منکسر المزاج بندوں کو گھیرے ہوئے ہے۔ ''و ما للظالمین من انصار'' (اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہے) دشمن کی پہچان یہ ہے کہ تیری دولت کی طرف راغب ہو، مگر جب تیری دولت کو نقصان پہونچ جائے تو تجھے چھوڑ دے۔ تیری پیٹھ کے پیچھے تجھ پر زبان کی تلوار سے حملے کرے اور تیری ثنا و صفت کرنی اُسے ناگوار گزرے، تو اُسے خدا پر چھوڑ دے۔ اس لیے کہ وہ خود ہی اوندھے منہ گرے گا۔ اُس کی مثال آگ سی ہے کہ لکڑی کو کھلاتی ہے اور اُس کے ساتھ خود بھی فنا ہو جاتی ہے۔ وکفیٰ باللہ نصیرا۔ (اور مددگار چاہیے تو اللہ کافی ہے) اور دوست کی علامت یہ

ہے کہ وہ خالص خدا کے لیے دوستی کرتا ہے۔ اگر ایسا کوئی رفیق مل جائے تو اُس سے راہ و رسم پیدا کر۔ اس لیے کہ سچے دوست نہیں ملتے ہیں۔ صوفیوں کی بعض باتوں کی تاویل کر لیا کر۔ گویا خدا کی مقرر کی ہوئی حدوں کے ذریعے سے تو شبہات کو اپنے دل سے دور کر دے، اگر میں منصور حلاج کے زمانے میں ہوتا اور جو الزام منصور کو لگایا گیا تھا وہ ثابت ہوجاتا۔ تو فتوے دینے میں میں بھی اُنھی لوگوں کے ساتھ ہوتا، جنھوں نے اُن کے قتل کا فتویٰ دیا اور اگر ثابت نہ ہوتا تو میں کوئی ایسی تاویل کرتا کہ اُن کی جان بچ جاتی اور میں اتنے ہی پر قناعت کرتا کہ اُنھوں نے توبہ کرکے خدا کی طرف رجوع کر لیا ہوگا کیوں کہ رحمت کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔

اللہ جل شانہ نے بڑے بڑے اعلیٰ مراتب اپنے ایک بندے کو عطا کیے ہیں اور جن لوگوں کو خدا نے بخش دیا ہے وہ اُن مرتبوں پر ترقی کرتے ہیں۔ ان مراتب نجات کے طے کرنے میں جسے معرفت کا بھید معلوم ہوگیا وہ تمام مخلوقات کے سامنے عاجزی کا سر جھکا دیتا ہے۔ اس لیے کہ معاملات کے انجام چھپے ہوئے ہیں۔ بخشش کا میدان وسیع ہے اور حضرت کریم جل شانہ کے لیے کسی چیز کی قید نہیں ہے۔ جو چاہے کرے اور جسے چاہے اپنی رحمت کے لیے مخصوص کرے: ''یختص برحمتہ من یشاء'' (اپنی رحمت کے لیے وہ جسے چاہتا ہے مختص کرتا ہے)۔

خراسان کے بعض عجمی صوفیوں نے کہا کہ صوفی کبیر ابن شہر یار قدس سرہ العزیز کی روحانیت عرب و عجم کے تمام صوفیوں پر متصرف ہے، کو میں جانتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔ اس لیے کہ اللہ جل شانہ سب سے بڑا کام کرنے والا اور عطا کرنے والا ہے صاحب دل لوگوں کے نزدیک حضرت سرور کائنات صلعم کی نیابت اہل اللہ میں باری باری اُن کے وقت اور حالات کے مطابق دورہ کرتی رہتی ہے اور روحانی تصرف کا مخلوق میں ہونا صحیح نہیں ہے۔ بلکہ اللہ جل شانہ کی مہربانی بعض ہی نہیں، تمام اولیا اللہ کے شامل حال ہے، جو شخص اولیا اللہ کو درگاہ ایزدی میں اپنا وسیلہ قرار دیتا ہے اُس کی حالت سدھر جاتی ہے۔ چنانچہ حضرت رب العزت فرماتا ہے: ''نحن اولیاؤ کم فی الحیٰوۃ الدنیا و فی الآخرۃ'' (ہم تمھارے دوست ہیں دنیا اور آخرت میں) خبردار اہل عجم کی زیادتیوں سے دھوکا نہ کھانا۔ اس لیے کہ اُن میں سے بعض حد سے گزر گئے ہیں اور حبیب خدا حضرت رسول مجتبیٰ صلعم نے اس کو منع فرمایا ہے۔ بندہ چاہے زندہ ہو یا مردہ، اُس میں کسی قسم کی قدرت خیال کرنے سے بچ، اس لیے کہ ساری مخلوقات ''لا یملکون لا نفسھم ضراً و لا نفعاً (اپنی ذات کے لیے نہ نقصان پہنچانے

پر قادر ہیں اور نہ نفع پہونچانے پر) یعنی نہ اُن سے فائدہ پہونچتا ہے نہ نقصان ۔ لیکن خدا کے دوستوں کی محبت کو درگاہ خدا میں وسیلہ بنا ۔ اس لیے کہ اپنے بندوں کے ساتھ خدا کی محبت خدائی کے بھیدوں میں سے ایک ہے اور جو چیز خدا کی درگاہ میں اچھا وسیلہ ہے ، وہ خدائی کا بھید اور پروردگار ہی کی صفت ہے ۔

ولی وہ مرد ہے جو دل و جان سے نبی صلعم کا دامن پکڑے اور خدا سے راضی ہو ، جو شخص خدا کے پاس پناہ لیتا ہے ۔ اُس کی عزت بڑھتی ہے اور جو شخص خدا کے سوا کسی اور پر بھروسہ کرتا ہے ، ذلیل ہوتا ہے ۔ جو کوئی شخص غیروں کے برتے پر بے پروا بنتا ہے حقیر ہوتا ہے اور جو شخص پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کے سوا کوئی اور راہ اختیار کرتا ہے گمراہ ہوتا ہے ۔ علم نور ہے اور خاکساری سرور ۔ مرد کے واسطے ہمت یہ ہے کہ اپنا حال خدا کے سپرد کر دے اور بہ حیثیت ایمان اعلیٰ درجے پر ہونے اور بہ حیثیت ہمت اعلیٰ درجہ رکھنے میں فرق اور تفاوت ہے ۔ جس کو اس بات کا یقین ہے کہ کار ساز مطلق اللہ جل شانہ ہے ، وہ اپنی ہمت کو دوسروں کی طرف سے پھیر لیتا ہے ۔ خدا کی راہ میں جس کی ہمت بلند ہو ، اُس کا بھروسہ خدا کے ساتھ درست ہے اور وہ دوسروں کے سائے میں پناہ نہ ڈھونڈھے گا ۔ فیاضی کا دسترخوان وہ ہے جس پر اچھے اور بُرے ہر طرح کے آدمی بیٹھیں ۔ خدا اپنے بندوں پر انجام میں ماں سے بھی زیادہ مہربان ہے ۔ اللہ جل شانہ اگر اپنے کسی بندے کو مہربانی سے کوئی نعمت عطا کرتا ہے ، تو پھر واپس نہیں لیتا ۔ سوا اس کے کہ اُس سے ناشکری ظاہر ہو ۔ خدائے برتر کی عنایتوں کا فیض عقل و وہم سے باہر ہے ، جو اس بات کو جانتا ہے کہ خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے ، وہ اپنے سب کام اُس کارساز مطلق کی مرضی پر چھوڑتا ہے اور اپنا سر رضا و تسلیم کی خاک پر رکھ دیتا ہے ۔

اگر کسی پر حقیقتوں کا راز کھل جائے تو وہ اُس کے صفحوں پر اس سطر کو پڑھے گا کہ ''کل شئی ہالک الا وجہہ'' (سب چیزیں ہلاک ہونے والی ہیں مگر اُس کی ذات) ہستی کے دائرون کو اگر تو غور کی نگاہ سے دیکھے تو تجھے نظر آئے گا کہ عاجزی بھی اُن میں گھری ہوئی ہے اور محتاجی بھی اُن میں قائم ہے اور طاقت ، دستگیری ، امیری اور قدرت سب خدا کے لیے ہیں ، جس کا نہ کوئی شریک ہے اور نہ کوئی مثل ۔ لوگ جو دم داعیہ رکھتے ہیں خود بینی میں مبتلا ہیں اور قسمت کا مقابلہ کرتے ہیں ۔ یہ اُن کے پاؤں کی لغزش ہے ۔ جیسا تیرا دعویٰ ہے ، ویسی ہی اگر تو طاقت اور قدرت بھی رکھتا ہوتا تو کبھی نہ مرتا ۔ تو چونکہ خودی اور غرور کا دعویٰ کر رہا ہے ، لہٰذا تجھے عزت سے کیا تعلق ؟ امیری و عزت کے گھوڑے سے اُتر اور غلامی و ذلت کا لباس پہن ۔ چونکہ تیرا

سارا دعویٰ جھوٹ ہے اور تیری ساری ریاست اور تیرا غرور فضول کی بکواس ہے لہٰذا ان چیزوں سے زبان روک اور کہہ کہ ہر چیز خدا ہی کی طرف سے ہے ۔

ان دو دیواروں کے درمیان میں چل ۔ دیوار شرع کے اندر اور دیوار عمل کے اندر ۔ پیروی رسول کے راستے پر چلتا رہ ۔ اس لیے کہ پیروی رسول ہی کا راستہ بھلا ہے اور بدعت کا راستہ برا ہے اور بھلائی اور برائی کے درمیان بہت بڑا فرق ہے ۔ اپنے سر کو تسلیم کے دروازے پر اور اپنی پیشانی کو عاجزی کی خاک پر رکھ ۔ اپنے عمل پر بھروسہ نہ کر ۔ خداوند عز و جل کی قدرت اور رحمت سے التجا کر اور خود بینی اور دو رخی جستجو سے پاک ہو ۔ اس لیے کہ اس ذریعے سے تو ایماندار اور پرہیزگار سعادت مندوں میں شامل ہو جائے گا ۔ نیکو کار بندے کی یہ برکت ہے کہ حضرت رب‌العزت کی قربت حاصل ہوتی ہے ۔ جناب باری کے دروازے پر اولیاء اللہ کی حرمت اور عزت ہے اور یہ خوش نصیبی اگر انھیں نہ عطا ہوتی تو اللہ جل شانہ اور لوگوں کو اپنی ولایت کے شرف سے مخصوص نہ کرتا ، وہ لوگ خدا کے جانباز بندے ہیں کہ اُن کے ذریعے سے حضرت رب‌العزت نے اپنی شریعت کو مضبوط فرمایا ۔ حقیقت شناسی کی اعانت کی ، اُن کی وساطت سے جناب رسالت مآب علیہ الصلوۃ والسلام کی فضیلت کو قائم رکھا اور انھیں حضرت پیغمبر صلعم تک پہونچا دیا ۔ چنانچہ اللہ جل شانہ نے ارشاد فرمایا ہے ۔ ''یا ایها النبی حسبک اللہ و من اتبعک من المومنین'' ۔ (اے نبی! تیرے لیے کافی ہے اللہ اور وہ مومنین جنھوں نے تیری پیری کی) اللہ جل شانہ کی معرفت مختلف طریقوں کی ہے اور اُس کی قسموں میں سب سے بڑی یہ ہے کہ اُس کے احکام کی عزت کی جائے ۔

خدا اور اُس کے بندوں کے درمیان غفلت کے سوا اور کوئی پردہ نہیں ہے ۔ وہ حضرت رب‌العزت فرماتا ہے ''اذکرونی اذکرکم'' (تم مجھے یاد کرو میں تمھیں یاد کروں گا) جو بندہ معرفت رکھتا ہے وہ اُسی کی درگاہ میں پناہ ڈھونڈھتا ہے اور اُس کی رحمت کا اُمیدوار رہتا ہے اور حق سبحانہ تعالیٰ بغیر اس کا لحاظ کیے کہ اُس نے کوئی عمل یا عبادت کی ہے ، یا نہیں اُسے اپنے فضل و کرم سے سرفراز فرماتا ہے ۔ دل اللہ جل شانہ کی دو انگلیوں کے درمیان رہتا ہے ۔ لہٰذا اُس کی درگاہ میں آہ و زاری اور اظہار عاجزی کرو تاکہ وہ دلوں کو اپنی محبت اور اپنے دین پر قائم رکھے ۔ ''و کفی باللہ ولیا'' (اور دوست چاہتے ہو تو اللہ کافی ہے) آدمیوں کا ظاہری رخ دو طرح کا ہے یا تو اُن کا ظاہر اچھا ہے یا بُرا اور اُن پر تصرف کرنے والا اللہ جل شانہ ہی ہے ، مگر فرق کیا ہے کہ بندوں کے اچھے کاموں سے راضی ہوتا ہے اور برے کاموں سے راضی نہیں ہوتا ؟ جس کا سبب یہ

ہے کہ اُس نے جزئی اختیارات بھی بندوں کو دے رکھے ہیں تو ٹیڑھے کو سیدھے کرنے کی کوشش اُس وقت تک نہ کر جب تک اُس کے سیدھے ہونے کا وقت نہ آئے کیوں کہ ابرِ رحمت اپنے وقت ہی پر برسا کرتا ہے اور قبل از وقت لوگ اُس کو نہیں چاہتے ۔ اپنے حوصلے کو تو رنج و الم کے ہاتھ میں نہ دے دے ، ورنہ اعلیٰ مقاصد سے محروم رہ جائے گا ۔ اس لیے کہ غم ہمت کے حق میں کافور کی شان دکھاتا ہے اور استقلال عنبر کی شان ۔ وہ کار ساز موجود ہے اور اُس کے سوا سب غائب ۔ اُنھیں چیزوں پر قائم رہ جو تجھے عطا ہوئی ہیں اور اُن کے بدلنے اور بننے میں جو بے چینی ہوتی ہے اُس سے اپنے نفس کو پریشان نہ کر ؛ اپنی ذات کو نہ مجبور خیال کر اور نہ مختار اس لیے کہ اصل حقیقت ان دونوں حالتوں کے درمیان میں ہے جو ولی خلاف ظاہر کہہ جاتا ہے اور اصول شرع پر حملہ کرتا ہے وہ قول و جلال ربانی کے پردے میں پڑا ہوا ہے تاکہ ربوبیت کے جلال سے مقہور ہو کے حکم ربانی کی طرف رجوع کرے ۔ اس لیے کہ اگر اُس نے قاب قوسین کی سچائی کی طرف رخ کیا اور حضرت رسالت کی پیروی اُس سے ظاہر ہوئی تو بندگی کے مرتبے کو پہونچ جاتا ہے جو سب سے اعلیٰ مرتبہ ہے اور خلقت کے لیے قربت الٰہی کا کوئی اُس سے بڑا اور قوی وسیلہ نہیں ہے ۔

جس کسی نے آنکھ میں توفیق الٰہی کا سرمہ لگایا ، اُس نے ہر چیز کو علم الیقین کی آنکھوں سے دیکھ لیا ۔ ٹھیک جانو کہ باطن اور ظاہر دونوں پر باطن کی حکومت ہے ۔ بصیرت اور دل کی صفائی اور آنکھوں کے نور کی رسائی کم کھانے اور کم پینے سے حاصل ہوتی ہے ۔ اس لیے کہ بھوک خود بینی ، کبر اور غرور کو مٹاتی ہے اور اُس کے ذریعے سے نفس کو یہ تکلیف دی جاتی ہے کہ حق کی طرف رجوع کرے ۔ دراصل بھوک سے بہتر کوئی نفس کو توڑنے والی چیز میں نے نہیں دیکھی ۔ وجہ یہ کہ پیٹ بھر کے کھانے سے گرانی ہوتی ہے ۔ دل تاریک ہوتا ہے اور نابینائی پیدا ہوتی ہے جو غفلت کو بڑھا دیتی ہے ۔ پڑوسیوں کی خاطرداری عزیزوں کی خاطرداری سے اچھی ہے کیوں کہ عزیزوں کا دل قرابت کے رشتے میں بندھا ہوا ہے اور پڑوسیوں سے یہ علاقہ نہیں ۔ جو دل روشن ہے وہ نیکوں اور عارفوں کی صحبت کی طرف میل کرتا ہے اور خود پرستوں اور نادانوں کی صحبت سے متنفر رہتا ہے ۔ خدا کے بندوں کے ساتھ بھلائی کرنا بندے کو خداوند جل و علاتک پہونچاتا ہے اور پیمبر علیہ الصلواۃ والسلام پر درود بھیجنا پل صراط پر گذرنے کو آسان اور دعا کو قبول کرتا ہے اور خیرات اللہ تعالیٰ کے غصے کو دُور کرتی ہے اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرنا نزع کی تکلیفوں کو آسان کرتا ہے ۔ بدکاروں ، احمقوں ، ظالموں اور حاسدوں کی صحبت ایک

گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے ۔

عارف وہ ہے ، جو سلوک کے بڑے برحق طریقے پر ہمیشہ اور استقلال سے چلے اور ایک لحظہ کے لیے بھی اُس کو نہ چھوڑے ۔ صوفی وہ ہے جو وہموں اور شکوں سے دُور ہے ۔ اللہ جل شانہ کی ذات و صفات کے بارے میں کہے ''لیس کمثلہ شئی'' ۔ (اس کے مثل کوئی چیز نہیں) اور اُس رب‌العزت کو یقین کے علم سے جانے ، تا کہ اُن لوگوں کے زمرے سے نکل آئے جو اُس حضرت عز و جل کو ظنی علم سے جانتے ہیں اور اُس کا گلا تقلید کی قید سے چھوٹ جائے ۔ صوفی وہ ہے جو حضرت رسول اکرم صلی علیہ وسلم کے سوا کسی اور کے طریقہ پر نہ ہو اور اُس کے سوا کسی اور چیز کو اپنے حرکات و سکنات کی بنیاد نہ قرار دے ۔ صوفی وہ ہے جو اپنے وقتوں کو اپنے نفس کے معاملات میں نہیں صرف کرتا ۔ اس لیے کہ جانتا ہے کہ مدبر حقیقی اللہ جل شانہ ہے اور اپنے معاملات و حالات میں سوا خدا کے کسی اور چیز پر بھروسا نہیں کرتا ۔ صوفی وہ ہے جو حتی الامکان خلقت کے ملنے جلنے سے پرہیز کرتا ہے ، اس لیے کہ وہ جس قدر مخلوقات سے ربط و ضبط بڑھاتا ہے اُسی قدر اُس کے عیوب کھلتے جاتے ہیں اور اس حقیقت اُس پر پوشیدہ رہ جاتا ہے ۔ بعض لوگوں سے اگر ملنا جلنا گوارا کرے تو پھر اس صورت میں نیک نفس لوگوں سے بھی صحبت برھائے ۔ اس لیے کہ وارد ہوا ہے : ''المر علی دین خلیلہ'' (مرد اپنے دوست کے دین پر ہے) ۔ فقیر کا نفس کبریت احمر کے مثل ہے ۔ حق چیز کو حق ہی میں صرف کرے ۔

جو شخص اپنی باتوں ، اپنے کاموں اور اپنے حالات کو ہر وقت قرآن و حدیث کی ترازو میں نہ تولے اور اپنے دل کو ملزم نہ پائے اُس کا نام ہمارے نزدیک مردوں کی فہرست میں درج نہیں ہوتا ، جو اپنی آمدنی کو جانتا ہے اُس پر اُس کا صرف کرنا آسان ہے ، جو شخص اپنے نفس سے ثابت قدم ہوتا ہے ، دوسرے لوگ بھی اُس کی وجہ سے ثابت قدم رہتے ہیں ۔ ٹیڑھی شاخ کا سایہ سیدھا کیونکر ہو سکتا ہے ؟ فقیر اگر اپنے نفس کو ذلیل و خوار کرے اور شوق و راست بازی کی آگ میں جلے تو خدا کی عنایت سے ثابت قدمی کے میدان میں قدم جما دیتا ہے اور نیکیوں کا خزانہ اور خلقت کا مطلوب بن جاتا ہے اور اُس منیہ کے مثل ہو جاتا ہے جو جس جگہ برس جاتا ہے فائدہ پہونچاتا ہے ، اور ایسے ابر رحمت کے زمانے میں خلقت خدا پر رحمت اور تسلی نازل ہوتی ہے ۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ لوگ جھوٹے کی پیروی کرتے ہیں اور سچے سے بھاگتے ہیں اور مغرور لوگوں کے گرد ہجوم کرتے ہیں اور جن لوگوں کو زمانہ نے چھوڑ دیا ہے اُن سے بھاگتے ہیں ۔ اس حالت کو دیکھ کے تو تعجب نہ کر ۔ اس لیے کہ یہی حالت نفس کی ہے ۔

نفس بھی سجی ہوئی کوشک ، زر نگار قصر اور وسیع ایوان کو پسند کرتا ہے اور عالی مرتبہ پیر شاندار عمامہ سر پر رکھ کے اور لمبی آستین لٹکا کے شان و شوکت ظاہر کرتا ہے ۔ اس پردے کے ہٹانے کے لیے تو اندرونی ہمت کو بلند کر نہ نفس کی ہمت کو اور اپنے نفس سے خطاب کرکے پوچھ کہ اگر تو ایک طرف رسول اکرم اور نبی معظم و مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس شان سے بوریے پر بیٹھا ہوا دیکھے کہ چٹائی کے نشان آپ کے جسم مطہر میں بنے ہوئے ہیں آپ کے اہل بیت رضوان اللہ و سلامہ علیہم فقر و فاقہ میں مبتلا ہیں اور نوکروں چاکروں کا کہیں پتہ نہیں ہے اور دوسری طرف تو کسرائے عجم کو دیکھے کہ مرصع تخت پر شان و شوکت سے بیٹھا ہوا ہے ۔ جس میں بیش قیمت موتی لگے ہیں ۔ اس کے اہل و عیال رنگ رلیاں منا رہے ہیں اور خدم و حشم کا ہر طرف ہجوم ہے ۔ تو ان دونوں میں سے تو کس کی طرف رخ کرے گا ؟ اور کس کا ساتھ دے گا ؟ اگر اللہ جل شانہ تیرے نفس کو توفیق دے تو تو یقیناً حضرت رسالت (صلعم) اور آپ کے اہل بیت رضی اللہ عنہم کو دوست رکھے گا ۔ اپنے دل کی ہمت کو اہل بیت نبوی کی حالت میں پہونچا تاکہ تو اللہ جل شانہ کے گروہ میں شمار کیا جائے چنانچہ قرآن پاک میں ارشاد ہوا ہے ''الا ان حزب اللہ ہم المفلحون'' (آگاہ ہو جاؤ کہ جو اللہ کے گروہ والے ہیں انھیں کے لیے فلاح ہے) اور خبردار کبھی اپنی بے نفسی کی طرف نہ دیکھ ۔ اس لیے کہ جو بھوک بغیر معرفت اور بغیر آداب ہدی (صلعم) کے ہو وہ تو کتوں کی ایک صفت ہے ۔ اپنی قدر و منزلت کو آداب ہدی کے ذریعے سے پہونچے ہوئے لوگوں کے اعلیٰ مرتبوں تک پہونچا اور اعمال خیر کے دکھاوا اور خودی و خودنمائی کے جذبات کو اپنی ذات سے نکال کے پھینک دے ۔ اس لیے کہ یہ چیز منجملہ شیطان کے جذبات کے ہے اور خدا کا خاص بندہ بن تا کہ قربت کے درجے کو پہونچے ۔ ''و کفی باللہ ولیا'' (اور دوستی چاہتے ہو تو اللہ کافی ہے) اس زمانے کے لوگ جادو گری ، کیمیاگری ، وحدت کا نام لینے ۔ زیادہ باتیں بنانے اور جھوٹے دعوے کرنے کے ذریعے سے اپنی گردن اونچی کرتے ہیں ۔ خبردار ایسے لوگوں کے پاس نہ پھٹکنا ۔ اس لیے کہ وہ اپنے پیروؤں اور اپنے پاس والوں کو دوزخ اور غضب الٰہی کی طرف کھینچے لیے جاتے ہیں اور خدا کے دین میں ایسی چیز داخل کر رہے ہیں جو اس میں نہیں ہے ، وہ لوگ ہماری جماعت میں خرقہ پوشوں کے گروہ سے ہیں ۔ تو انھیں دیکھے تو سجھے گا کہ ان کی دعا قبول ہوتی ہے اور وہ خدا کے مقرب لوگوں میں ہیں ۔ اگر ان میں سے کسی کو تو دیکھے تو فوراً اس سے بھاگ ۔ خدا کے پاس جا کے پناہ لے اور کہہ ''یا لیت بینی و بینک بعد المشرقین'' ۔ (کاش مجھ میں اور

تجھ میں مشرق و مغرب کا فرق ہوتا) اگر کوئی جاہل شخص تجھے ہاتھ پکڑ کے اس گروہ سے الگ لے جائے اور کہے کہ ذکر الٰہی میں مشغول رہ اور قرآن و حدیث کی پابندی کر تو وہ اُن تمام جھوٹے دعوے کرنے والوں سے اچھا ہے ۔ جو اپنے کو خرقہ پوش بنائے ہوئے ہیں ۔ ان سے اس طرح بھاگ جس طرح لوگ غضب آلود شیر سے یا کوڑھی سے بھاگتے ہے ۔

حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بہت سے لوگ حضرت فخر کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دریافت کرتے تھے کہ نیکی کیا ہے ؟ مگر میں یہ پوچھتا تھا کہ برائی کیا چیز ہے اس اندیشے سے کہ کہیں اس میں مبتلا نہ ہو جاؤں ۔ اسی بنیاد پر میں نے عرض کیا : ''یا رسول اللہ (صلعم) لوگ جہالت اور بدکاری میں مبتلا تھے اور حق سبحانہ تعالیٰ نے اس روشن دین اسلام کو نیکی کے ساتھ ظاہر فرمایا ۔ کیا اس نیکی کے بعد پھر ہمیں برائی سے سابقہ پڑے گا ؟'' ارشاد ہوا ''ہاں'' میں نے عرض کیا : ''پھر اس برائی کے بعد نیکی ظاہر ہوگی ؟'' فرمایا ''نعم و فیہ و خن'' یعنی (ہاں اور اسی نیکی سے اس برائی کی خرابی اور شومی ظاہر ہوگی) میں نے عرض کیا : ''اس کی شومی کیا ہے ؟'' ارشاد ہوا : ''قوم'' یہدون بغیر ہدیٰ تعرف منہم و تنکر'' یعنی (ایک ایسا گروہ پیدا ہوگا جو لوگ گمراہی کی طرف رہبری کریں گے ۔ آپ کو راہ راست پر دکھائیں گے ، حالاں کہ ایسے ہوں گے نہیں) میں نے دریافت کیا ''کیا اس کے بعد بھی برائی کا ظہور ہوگا ؟'' ارشاد ہوا ہاں ''دعاۃ'' علی ابواب جہنم من اجابہم قزفوہ فیہا'' ۔ یعنی (ایک ایسی جماعت ہوگی جو لوگوں کو دوزخ کے دروازوں کی طرف بلائے گی اور جو کوئی شخص اُن کی پیروی کرے گا آسے فوراً دوزخ میں ڈھکیل دیں گے) میں نے کہا ''یا رسول اللہ مجھے اُن کا پتہ بتائیے'' ۔ ارشاد ہوا کہ ''ہم من جلد تناتیکمون بالسنتنا'' یعنی (وہ لوگ ہمارے لباس میں ظاہر ہوں گے ہماری ہی زبان میں گفتگو کریں گے) میں نے عرض کیا : ''میں اس زمانے میں اگر موجود ہوں تو مجھے کیا کرنا چاہیے ؟'' ارشاد ہوا ''تم مسلمان کی جماعت اور ان کے امام کا ساتھ نہ چھوڑنا'' ۔ میں نے عرض کیا ''اگر ان لوگوں کی جماعت نہ ہو اور ان کا کوئی امام بھی نہ ہو تو کیا کروں ؟'' فرمایا تو تُو ان سب فرقوں سے علحدگی اختیار کر ۔ اگرچہ یہاں تک نوبت پہونچ جائے کہ مارے بھوک کے تو کسی درخت کی جڑ کو چوستا اور چاٹتا ہو اور اسی حالت میں تیرا دم نکل جائے ۔ یہ وصیت ہے ہمارے پیغمبر امین ، ہمارے سردار اور سردار عالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی ، اس کو یاد رکھ اور اس پر عمل کر اور خبردار ! راستہ بتانے میں بخل نہ کر ۔ مطلب یہ کہ اگر کوئی تجھ سے

سیدھی راہ پوچھے تو اس کے سوال کو ہرگز رد نہ کر ۔ اس لیے کہ ایسی روش سے خدا اور بندگان خدا کے ساتھ بےادبی ہوتی ہے ۔ اس چال ہی کی بنا ذلت و خواری پر پڑی ہے ۔ چناں چہ اگلے زمانے کے لوگوں نے اپنے آپ کو ذلیل و حقیر کیا اور خدا تعالیٰ نے انھیں معزز بنا دیا ۔ انھوں نے اپنے تئیں فقیر کہا اور اللہ جل شانہ نے اپنے کرم سے انھیں تمام لوگوں سے زیادہ دولت مند کر دیا اور ایسے لوگوں کی صحبت سے پرہیز کر جو بزرگوں کے کلام کی تو ہمیشہ تاویل کیا کرتے ہیں ۔ مگر ان کے جانب منسوب ہونے کے اوپر اور نیز ان کی حکایتوں پر نازاں ہیں ۔ وجہ یہ کہ ان کہانیوں میں بہت سی ایسی ہیں جو جھوٹ اور افترا ہیں اور سوا اس کے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کہانیاں مخلوقات پر خدا کا ایک قسم کا عذاب ہیں ۔ جب انھوں نے امر حق کو نہ جانا اور نیکی کی انھیں حرص ہوئی تو خدائے عز و جل نے انھیں بےعقل لوگوں کے ہاتھ میں مبتلا کر دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں میں جنھیں نبوت کی پاکیزگی حاصل ہے انھوں نے فرقہ ہائے مرغبہ[1] (ترغیب کرنے والوں) مرہبہ (ترہیب کرنے والوں یعنی عذاب الٰہی سے ڈرانے والوں) غامضہ (چشم پوشی کرنے والوں) اور ظاہرہ (یعنی اہل ظاہر اور محض ظاہری الفاظ حدیث پر چلنے والوں) کی طرح افترا پردازیاں کیں اور حضرت رب‌العزت نے بعض اہل بدعت اور گمراہوں کو اس کام پر مسلط کیا ہے کہ جھوٹ بولیں اور بزرگوں کے کلام میں افترا پردازیاں کریں ۔ انھوں نے ان کے کلام میں ایسی ایسی باتوں کو داخل کر دیا ہے جن کی خود انھیں خبر بھی نہ تھی ۔ بعض لوگوں نے ان کی پیروی کی اور سب سے بدتر گناہوں میں مبتلا ہو گئے ۔ خبردار ایسے لوگوں سے بھاگ اور اعلیٰ مراتب حاصل کرنے کے لیے حضرت پیغمبر ذی شان علیہ الصلوۃ والسلام کے دامن کو پکڑ اور شرع شریف کو نظر کے سامنے رکھ ۔ اجماع امت کی عام

۱- پہلے دو فرقوں یعنی مرغبہ و مرہبہ سے غالباً حضرت شیخ سید احمد رفاعی قدس سرہ‌العزیز کی مراد واعظین سے ہے ۔ جو ترغیب و ترہیب کی طرف جھکتے ہیں تو ہر طرح کی ضعیف و موضوع روایات بلکہ بےبنیاد کہانیاں بیان کرنے لگتے ہیں ۔ غامضہ سے شاید وہ علما مراد ہیں ۔ جو لوگوں کو بگڑتے اور ضلالت میں پھنستے دیکھتے ہیں اور چشم پوشی کرتے ہیں اور جنھیں مداہنت کا الزام دیا جاتا ہے اور ظاہرہ سے ظاہر یہ فرقہ والے اہل حدیث مراد ہیں جو حدیث کے ظاہری الفاظ کے ایسے گرویدہ ہیں کہ ضروری اور فطری قیاسات سے بھی بھاگتے ہیں ۔ مثلاً کسی جگہ پیشاب کرنے کی ممانعت آئی ہو تو کہتے ہیں کہ وہاں صرف پیشاب ہی منع ہے ، پاخانہ وہاں پھرے تو مضائقہ نہیں ۔ واللہ علم بالصواب ۔

(ناظم العرفان)

سڑک تجھ پر آشکارا رہے اور اہل سنّت کے گروہ سے جو کہ مسلمانوں میں نجات پانے والا فرقہ ہے، دور نہ ہو اور خدا کے حکموں کو مضبوط پکڑ اور سوا ان کے ہر چیز کو چھوڑ دے اور میری باتوں کو دل میں یاد رکھ۔

فلیتک تحلو و الحیاۃ مریرۃ و لیتک ترضیٰ والانام غضاب

اے خدا! تجھ میں حلاوت ہوتی، زندگی چاہے تلخ کیوں نہ ہوتی اور راضی ہوتا اور ساری خلقت چاہے برہم ہی ہوتی۔

و لیت الذی بینی و بینک عامرٌ و بینی و بین العالمین خراب

اور وہ وسعت جو میرے تیرے درمیان ہے آباد ہوتی اور میرے اور سارے عالم کے درمیان جتنی وسعت ہے وہ سب چاہے اجاڑ پڑی ہوتی۔

اذ اصح منک الوُدّ فالکل ہینٌ و کل الذی فوق التُراب تراب

جب تیری دوستی صحیح ثابت ہو جائے تو سب چیزیں ہیچ ہیں اور خاک کے اوپر جو کچھ ہے سب خاک ہے۔

مشائخ کی پاک دامنی و عصمت کا اعتقاد اس طرح نہ کر جس طرح لوگ کرتے ہیں جنھیں ان کی نسبت غلو ہے اور جو چیز تیرے اور خداوند جل و علا کے درمیان ہو، اس کے بارے میں مشائخ پر بھروسہ نہ کر۔ اس لیے کہ اللہ جل شانہ بڑا غیرت والا ہے اور نہیں چاہتا ہے کہ اس کے اور بندے کے درمیان میں کوئی اور آ جائے۔ مشائخ (خدا ان سے راضی ہو اور وہ اس سے راضی ہوں) صرف طریقت کے رہنما ہیں جن سے رسول اللہ صلعم کے حالات دریافت کیے جاتے ہیں اور ہم اس حضرت رب العزت کی درگاہ میں عجز و زاری سے عرض کرتے ہیں کہ ان سے راضی رہے۔ یہ امید لگا کے کہ وہ پروردگار عالمین اپنے خاص بندوں کو شرمندہ نہ کرے۔ اس لیے کہ وہ سب بڑوں سے بڑا ہے۔

خود فروشی کو چھوڑ اور سر تسلیم جھکانے کی وضع اختیار کر اور اگر لوگوں کو تو خود فروشی کرتے دیکھے تو اپنے تئیں ان سے الگ کر لے۔ اس لیے کہ حضرت رسالت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ''اذا رایت شحاً مطاعاً و ہویً متبعاً وا عجب کل ذی رایٍ برائہ فعلک بخویصۃ نفسک'' یعنی (جب تو ایسی حرص دیکھے جس کے لوگ بندے ہوں۔ ایسی خواہش نفس دیکھے جو لوگوں پر حکومت کرتی ہو اور ہر رائے والا اپنی رائے پر ناز کر رہا ہو تو خبردار تو سب سے علیحدہ ہو کے تن تنہا بیٹھ رہ)۔

اپنے اخلاق کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق کر جو حسب ذیل ہیں۔ عادات میں نرمی، مذاق نیک، نہایت بُردبار، بڑا معاف کرنے والا سچا جوان مرد، نرم دل، ہنس مکھ، برداشت کرنے والا، منکسر المزاج، خاطر

داشت کرنے والا صحبت کا لحاظ رکھنے والا ، مسلسل غم میں اور ہمیشہ سوچ میں رہنے والا ، ساکت و صامت ، مصیبتوں پر صبر کرنے والا ۔ اللہ پر بھروسا رکھنے اور اس سے مدد چاہنے والا ، فقیروں اور ضعیفوں کا دوست اور حرام باتوں پر برہم ہوجانے والا ۔ جو کچھ مل جائے کھا لے اور جو چیز کھو گئی ہو اس کے لیے غمگین نہ ہو ۔ تکیہ لگا کے کھانا نہ کھا ۔ کپڑے سخت اور موٹے پہن تاکہ دولت مند لوگ تیری پیروی کریں اور نئے کپڑے پہن کے محتاجوں کا دل نہ دکھا ۔ عقیق کی انگوٹھی انگلی میں پہن اور سخت بچھونے پر یا چٹائی پر یا کھلی زمین پر سو اور طور طریق ، بات چیت اور حالات و افعال میں سنت حضرت رسالت پر استقلال سے قائم رہ ۔ اچھے کو اچھا اور برے کو برا کہہ اور بغیر ذکر الٰہی کے نہ بیٹھ اور نہ اٹھ ۔ تیری محفل حلم ، علم ، حیاء ، اور امانت کی صحبت ہو اور تیرے پاس اٹھنے بیٹھنے والے چاہیے کہ فقیر اور محتاج لوگ ہوں ۔ اپنا چال چلن نہ بگاڑ اور زانی نہ بن نہ کسی کی مذمت کر اور نہ ثواب کی بات کے سوا کوئی بات زبان سے نکال ۔ اپنے ہر ہم صحبت کو اس کا حق دے ۔ اپنے پاس لوگوں کا ہجوم نہ کر اور لوگوں سے پرہیز اور علحدگی اختیار کر اور کسی سے بھی اپنا ہنستا ہوا چہرہ نہ چھپا اور کسی کے ساتھ وہ بات نہ کر جس سے اسے نفرت ہو ۔ اپنی زبان اور اپنے کان کو بری بات کے کہنے اور سننے سے بچا ۔ خدمت گار سے ڈانٹ ڈپٹ نہ کر اور جو تجھ سے سوال کرے اس کو نہ پھیر ۔ اگر کچھ پاس نہ ہو تو میٹھی باتوں سے اس کا دل اپنے ہاتھ میں لے ۔ اگر دو مختلف کاموں کے کرنے میں تجھے تردد ہو تو جو سب سے آسان نظر آئے اور اس میں گناہ نہ ہو ، اسے اختیار کر ۔ دعوت کو قبول کر اور دوستوں اور بھائیوں کی تلاش میں رہ ۔ جو تجھے ستائے اسے معاف کر دے ، برائی کا مقابلہ برائی سے نہ کر ۔ راتوں کو اللہ جل شانہ کی درگاہ میں زاری کر اور خدائے وحدہ لا شریک سے خوش رہ ۔ و کفٰی باللہ ولیا ۔

ہمارے امام شافعی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے : ''جس کسی نے اپنے نفس کو فقیر دیکھا وہ استقامت کے درجے کو پہونچ گیا'' ۔ نیز یہ فرمایا ہے کہ ''پاک بازی کے چار رکن ہیں ۔ عادات و اطوار کا اچھا ہونا ، تواضع یعنی انکسار جوان مردی اور اپنے نفس کی مخالفت'' ۔ یہ بھی ارشاد فرماتے ہیں کہ ''انکسار سے محبت پیدا ہوتی ہے اور تھوڑے پر قناعت کرنے سے آرام ملتا ہے'' اور فرمایا ہے کہ ''اچھا آدمی وہ ہے جو ہوشیار ، دانا اور لوگوں کے معاملے میں جان بوجھ کے غفلت کرنے والا ہو'' اور فرماتے ہیں ''علم وہ ہے جو فائدہ پہونچائے ۔ فقیری میں اپنے نفس کو ایک بہادر شخص تصور کر ، تاکہ تجھ میں استقلال پیدا ہو اور پاک بازی کے اصول کو مضبوطی سے اختیار کر ۔ تاکہ تیرا شمار پاک بازوں

میں ہو ۔ انکسار اور قناعت کر، تاکہ تو لوگوں میں ہردل عزیز ہو اور مکروہات زمانے میں تجھے آرام ملے اور سب چیزوں کو بھلا دے ۔ تاکہ تو اچھا ہوجائے اور علموں میں سے اس علم کو اختیار کہ جو بارگاہ الٰہی میں نفع پہونچائے ۔ اس لیے کہ تیری یہ دنیا صرف خیالی ہے اور یہ جو کچھ ہے مٹ جانے والا ہے اور تمام حالات میں رد و بدل کرنے والا اللہ جل شانہ ہے ۔ اے وہ شخص جس کی سانسیں گنی ہوئی ہیں ضرور ہے کہ ایک دن یہ گنتی پوری ہو جائے گی ۔ ضرور ہے کہ کوئی دن ایسا آئے جس کے بعد رات نہ ہو اور کوئی رات ایسی آئے جس کی صبح نہ ہو ۔

اللہ تعالٰی نے اپنے ولیوں کو اپنے گنبد کے نیچے پوشیدگی کا لباس پہنایا ہے اور اپنے سوا تمام چیزیں اُن کی نظر سے چھپا دی ہیں ۔ اس کا بھی مطلب یہ ہے کہ مخلوقات کی نسبت اپنا گمان اچھا رکھا جائے ۔ یہ ہرگز نہ کر کہ کسی کے خلاف شرعی دلیلیں قائم کرتے وقت تو اُس کی جانب بدگمانی کرے ۔ خدا کی شریعت کا پابند رہ اور نفسانیت اور خود غرضی کو چھوڑ دے بلکہ ہر کام کو خلوص نیت کے ساتھ کر ، کیوں کہ نفسانیت ایک دل کا مرض ہے اور جس چیز کو شریعت نے ُبرا کہا ہے ، اسے تو بھی ُبرا کہہ اور جسے شریعت نے اچھا بتایا ہے اسے تو اچھا بتا اور اپنے قول و فعل سے سوا رضامندی الٰہی کے اور کسی چیز کو ظاہر نہ کر ۔ جب تک شرع کی دلیل سے ثابت نہ ہو جائے ۔ خدا کے بندوں پر بدگمانی نہ کر ، بلکہ ہر شخص کی نسبت اچھا ہی گمان رکھ ۔ چونکہ جناب باری عز اسمہ اپنے بندوں کی پوشیدہ باتوں کو جانتا ہے اور ظاہر نہیں کرتا ۔ جیسا کہ وارد ہوا ہے : ''و لکلّ وجھۃ ہو مو ّلیھا'' (ہر طریقہ کا وہی والی ہے) لٰہذا تجھے چاہیے کہ سردار انبیاء صلوات اللہ و سلامہ علیہ کی روشن شریعت کے دلائل کی طرف توجہ کرے ۔ ''و کفیٰ بربک ہادیاً و نصیراً '' (تجھے ہدایت کرنے اور تیری مدد کرنے کے لیے اللہ کافی ہے) عقل ہر چیز کو سمجھ کے ذریعے سے قبول کرتی ہے اور جو ذات کہ سمجھ سے باہر ہے اُس کے سوا اور کسی چیز کے ماننے سے انکار کرتی ہے ۔ لٰہذا اپنی ہمت کو تو دل سے وابستہ رکھ اور اپنی دانائی کو عقل سے۔ تاکہ تجھے کامیابی حاصل ہو ، ہاتھ میں ایک رگ ہے جو دل سے ملی ہوئی ہے ۔ دنیا کی کوئی چیز انسان ہاتھ سے لیتا ہے تو اس کی دل پر جا پہونچتی ہے اور یہ ایک بہت بڑی اور خطرناک آفت ہے ، جس سے لوگ واقف نہیں ہیں ۔ فخر کائنات حضرت رسول مکرم علیہ التحیات نے فرمایا ہے : ''ُحبّ الدنیا راس کل خطیئۃ'' (دنیا کی محبت سارے گناہوں کی جڑ ہے) لٰہذا تو دنیا سے بچ اور اُس کی لذتوں سے دور رہ ۔ خبردار رات کو جانوروں کی طرح نہ سو ۔ رات میں چونکہ اللہ جل

شانہ کی تجلیاں ہوتی ہیں اور اُس کے نور کی نسیم چلتی ہوتی ہے اس لیے شب زندہ داری کرنے والے اُسے غنیمت خیال کرتے ہیں اور سونے والے اس کی برکتوں سے محروم رہتے ہیں اور اس مغرور عیش سے جو خواب شریں کے مزے لوٹتا اور خدا کی جانب سے بے پروا ہو جاتا ہے کہہ دے ، کہ :

اے رات کو سونے والے اور لذت خواب کے مبتلا ۔ یہ نیند بیداری کے ہاتھ میں رہن ہے ، چاہے تو اُسے بھول جائے مگر وہ تجھے نہیں بھولتا ، جو زمانے کا پلٹنے اور طرح طرح کے انقلابات کرنے والا ہے ، مشاہدے سے عبارت وہ قربت باری تعالیٰ ہے جس کے ساتھ علم الیقین اور حق الیقین ہو اور جس شخص کو خدائے تعالیٰ نے دوری اور غفلت سے بچایا ہے ، اُس نے علم الیقین کے ساتھ خدا کی قربت حاصل کی اور حق القین کے یہ معنی ہیں کہ ''اُعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک'' (خدا کی اس طرح پرستش کر کہ گویا تو اُسے دیکھ رہا ہے اور اگر تو اُسے نہ دیکھتا ہو تو وہ تجھے دیکھ رہا ہے) ۔ تو بس شہود کے مرتبہ کا حاصل ہونا اسی سے عبارت ہے اور شہود اس کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے ، ورنہ لغوی معنوں پر اس دنیا میں مخلوق خدا کے لیے خدا کا دیکھنا ٹھیک ثابت ہوتا اور مشاہدۂ جمال باری کے بارے میں لغوی اور معنوی دونوں حیثیتوں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ تیرے لیے کافی ہے ۔ جمال باری عز اسمہ کا جلوہ دیکھنا صرف صاحب قوسین (حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ مخصوص ہے مگر اس میں بھی اختلاف ہے کہ یہ جلوہ آپ نے انھیں آنکھوں سے دیکھایا دل کی آنکھوں سے اور اس امر میں حضرت رسول آخرالزمان علیہ السلام کو خصوصیت حاصل ہونا اہل دل لوگوں کے نزدیک یقینی اور آشکارا ہے تو خداوند عز و جل کی قربت حاصل کرنے کے لیے تو اپنے نفس کو ویسا ہی ادب سکھا اور ویسا ہی مہذب بنا جیسا کہ خود خدا تعالیٰ کی مرضی کے موافق ہو ۔ اس لیے کہ اس طرح تیرا شمار بھی مقربان بارگاہ صمدیت میں ہوگا ۔ چنانچہ مشہور ہے کہ : ''لا یزال عبدی یتقرب الی بالنوافل'' (میرا بندہ ہمیشہ نفل عبادتوں کے ذریعہ سے مجھ سے قربت حاصل کرتا ہے) اور حدیث شریف میں وارد ہے : ''ہدی اللہ ہو الہدی'' اللہ کی ہدایت ہی ہدایت ہے ۔ ''و کفیٰ باللہ ولیا'' (اور دوست چاہتے ہو تو اللہ کافی ہے) ۔

اگر اس فن کا کوئی اُستاد ملے تو اُس کا شاگرد ہو جا اور اگر وہ چومنے کے لیے اپنا ہاتھ تیری طرف بڑھائے تو تو اُس کا پاؤں چوم اور اُس کے پیچھے پیچھے رہ ۔ اس لیے کہ پہلی چوٹ سر پر ہی آتی ہے ۔ اگر کوئی ظالم تجھ پر ظلم کرے اور تو انتقام لینے کی کوئی تدبیر نہ کر سکتا ہو تو اس صورت میں تو چار و ناچار

درگاہ خداوندی میں التجا کر سکتا ہے ۔ بس اپنے دل کو تو ما سوا اللہ سے پھیر اور اپنی امیدوں کو اُس رب العزت کی درگاہ میں پیش کر اور اپنا کام اُسی کے سپرد کر دے تا کہ وہ تیری مدد کرے اور تیرے لیے ایسی کارسازی کرے جو تیرے خیال میں بھی نہ گزری ہو ۔ سر تسلیم جھکانا اور صدق دل سے التجا کرنا اسی سے عبارت ہے ۔ رضائے باری کی طرف اپنی ہمت کو خدا کی مرضی و مشیئت کے مطابق متوجہ کر جیسا کہ حضرت موسیٰ کاظم علیہ السلام نے کیا ، جبکہ ہارون رشید (خدا اُس کے گناہوں کو معاف کرے) آپ کو باندھ کے مدینہ منورہ سے بغداد لے گیا اور قید خانے میں ڈال دیا ۔ یہاں تک کہ آپ نے اُسی قید میں زہر کے ذریعے سے جام شہادت پیا ۔ قید خانے سے آپ کا جنازہ نکلا اور مرتے دم تک آپ نے رضائے الٰہی سے منہ نہیں پھیرا تھا ۔ لہٰذا یہ وہ مرتبہ تھا جسے فوزعظیم کہتے ہیں ، جسے نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی کے دل میں گزرا ہے ۔ ''انما یوفی الصابرون اجرہم بغیر حساب'' (صبر کرنے والوں کو اللہ اُن کا اجر بے حساب عطا فرمائے گا) اور ائمہ اہل بیت کرام علیہ السلام باوجود بزرگی اور اعلیٰ مرتبہ رکھنے کے خالص مرضی الٰہی پر راضی و صابر رہے ۔

کہتے ہیں کہ عبدالملک بن مروان جو بنی امیہ میں سے تھا حضرت امام علی زین العابدین علیہ السلام کو ہاتھ پاؤں اور گلے میں طوق و سلاسل ڈال کے مدینہ منورہ سے شام میں لایا تھا ۔ اس حالت میں زہری رحمۃ اللہ علیہ آپ کے رخصت کرنے کو آ کے روئے اور کہا ''اے فرزند رسول اللہ ! اور اے جگر گوشۂ جناب زہرا ! آرزو تھی کہ آپ کے عوض میرے ہاتھ پاؤں میں زنجیریں ہوتیں''۔ جناب امام زین العابدین نے فرمایا : ''کیا تم خیال کرتے ہو کہ اس حالت میں مجھے تکلیف ہے ؟ اگر میں چاہتا تو ان امور میں سے کوئی بات بھی ظہور میں نہ آتی مگر میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ خدا کے عذاب کو نہ بھولوں ۔'' یہ فرماتے ہی آپ نے اپنے ہاتھ پاؤں کو زنجیروں میں سے چھڑا کے دکھا دیا اور پھر خود ہی وہ زنجیریں پہن لیں یہ دیکھ کے زہری رحمت اللہ علیہ کو معلوم ہوا کہ جناب زین العابدین رضی اللہ عنہ رضائے الٰہی اور تسلیم محض کے مرتبے کو پہنچ گئے ہیں اور آپ کو '' فوزعظیم'' کی منزلت حاصل ہے جس کو معلوم کرکے زہری رحمۃاللہ علیہ کے دل کو چین آیا اور اُن کا نفس اذیت سے چھوٹ گیا ۔ اگر تو رضا کے مرتبے کو پہونچ سکتا ہو جو سب سے اعلیٰ مرتبہ ہے تو اپنے نفس کو تول اور اس کے قابل بنا ۔ ورنہ دوسرے مرتبے میں اُتر آ جس سے ''خلوص التجا'' عبارت ہے اور جس میں یہ کرنا ہوتا ہے کہ تدبیر ، طاقت ، قدرت اور اپنے تمام

جزئی و کلی معاملات سے کلیۃً قطع امید کرکے خدا پر بھروسہ کر لیا جائے اور خداوند عز و جل تیرے ارادے اور تیری تدبیر سے زیادہ اپنی مدد اور قدرت سے تیرے کام کو سدھار دے گا ۔ و کفٰی با للہ نصیراً (اور مدد گاری کے لیے اللہ بس ہے) ۔

اگر تو خداوند جل علا کی طرف دوڑتا اور اس کی درگاہ میں التجا کرتا ہے تو اس بارے میں حضرت حبیب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو وسیلہ قرار دے اور جہاں تک ممکن ہو زیادہ تر درود و سلام کو ورد زبان کر اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل کرکے بارگاہ ایزدی کے دروازے پر کھڑا رہ اور اسی حضرت رب العزت پر بھروسہ کرکے ہر چیز کو اس سے مانگ اور اگر تیرے سامنے دروازے بند ہوں تو کھولنے والے کا امیدوار رہ ۔ اگر بندے کسی راہ کو بند کر دیں تو صرف خدائے عز و جل اپنی ربوبیت اور الوہیت سے اُسے کھول دے گا ۔ اُس کی رحمت سے نااُمید نہ ہو اور اُس کی روح سے مایوس نہ ہو ، اپنے آپ کو اُسی سے ملا دے ''وکفی باللہ ولیا'' (اور دوستی کے لیے اللہ کافی ہے) ۔

تمام حالات پر صرف حضرت رب العزت کی توفیق پر بھروسا کرنا واجب ہے ۔ غم و تکلیف کو حاسد کے لیے چھوڑ دے کہ اُس کی تکلیف ہی اُس کے لیے کافی ہے اور بیوقوف کی طرف داری سے دست بردار ہو کیونکہ اگر تو اس سے باز نہ آیا تو اُس کے رنج میں تو بھی مبتلا ہو جائے گا ۔ عقلمندوں کی صحبت کا رخ کر اور دانائی کی بات کو تو جہاں دیکھے ، اختیار کر لے ۔ اس لیے کہ دانائی کی بات اگر دیوار پر لکھی ہو تو بھی عقل مند آدمی اُسے لے لیتا ہے اور یہ نہیں پوچھتا کہ کس نے اسے کہا اور کس سے مروی ہے یا کس کافر سے سنی گئی ہے ۔ یہ جہان عبرت کے لیے پیدا ہوا ہے اور عقل مند آدمی دنیا کی ہر چیز سے عبرت پکڑتا ہے ۔ عبرت کو جہاں ملے تو اپنی عقل کی قوت سے لے لے اور اس کو نہ دیکھ کہ کہاں سے ملی ہے ۔ خبردار دنیا داروں کے پاس نہ جا ۔ اس لیے کہ اُن کی قربت سے آدمی کا دل سخت ہو جاتا ہے ۔ اُن کے آگے سر جھکانے سے اللہ جل شانہ غضب آلود ہوتا ہے اور اُن کی تعظیم و تکریم سے گناہ بڑھتے ہیں ۔ فقیروں کا دوست بن اور اُن سے صحبت رکھ اور پوری تعظیم و تکریم کے ساتھ اُن کی خدمت گزاری میں مشغول رہ اور اگر اُن میں سے کوئی تیرے پاس آئے تو فوراً کھڑے ہو کے اُس کی تعظیم کر اور تیری خدمت گزاری کو اگر فقرا پسند کریں تو اُن سے دعائے خیر کی خواہش کر اور کوشش کر کہ اُن کے دلوں میں تو اپنا گھر آباد کر ۔ اس لیے کہ فقیروں کے دل رحمت الٰہی کی جگہ ہیں اور بشری خود پرستیوں سے اپنے دل کو پاک کر اور جو کوئی تجھ پر کوئی حق رکھتا ہو تو

اُس کے ساتھ ایسا اچھا اخلاق برتاؤ کر کہ وہ تیرا حق دیوے اور تو بھی اُس کا حق ادا کرے اور اگر ھو سکے تو اپنے حق کو قربان کر دے اور اُس کے معاوضے خدا سے مانگ اور لوگوں میں ادب کے ساتھ رہ ۔ اس لیے کہ آدمیوں کے ساتھ باآدب رہنا ویسا ہی ہے جیسے کہ خدا کے ساتھ باآدب رہنا ۔ خودبینی ، نسب پر ناز کرنے اور اپنے لائق و فائق ہونے کے خیال سے کلیۃً توبہ کر اس لیے کہ اگر کوئی عمل میں رہ جائے تو نسب اُسے نہیں بچاتا ۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے صلہ رحم کو بجا لا اور آپ کے اہل بیت کی تعظیم کر ۔ اس لیے کہ آپ کے احسان کا طوق ہمارے گلے میں ہے ۔ چنانچہ اللہ تعالٰی نے فرمایا ہے : ''قل لا اسئلکم علیہ اجراً الا المودۃ فی القربٰی'' (کہہ دے اے محمدؐ اس کا تم سے میں کوئی اجر نہیں چاہتا مگر قرابت داروں کے ساتھ دوستی کرنا) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اصحاب کی محبت کو دل میں محفوظ رکھ ۔ اس لیے کہ وہ ہدایت کے چراغ اور رہنمائی کے تارے ہیں ۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے : '' اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اہتدیتم'' (میرے صحابہ مثل تاروں کے ہیں ان میں سے جس کی پیروی کرو گے ہدایت پاؤ گے) خدا سے ڈر ۔ کیونکہ اصل حکمت اللہ کا خوف ہے ۔ چاہیے کہ تو خدائے تعالٰی سے ڈرتا رہے ۔ کیونکہ وہ ہر نیکی کا مجمع ہے ، یہ ہے نصیحت میری تجھے :

اے بھائی ۔ جان لے کہ تعلیم نے تجھے مدہوش کر دیا ہے ۔ میں نے زمانے اور اہل زمانہ کو آزمایا ۔ اپنے نفس کے ساتھ مجاہدہ کیا ۔ شرع شریف کی خدمت کی اہل صفا کی صحبت سے فائدہ اُٹھایا ، میری نصیحت کو قبول کر ۔ کیونکہ یہ اُس خلوص محبت سے نکلی ہے جو مجھے تیرے ساتھ ہے بہت سے سننے والے کہنے والے سے زیادہ دانا بھی ہوتے ہیں ۔

اے عبدالسمیع میری نصیحت پر عمل کر اور مجھے کوئی بہت بڑا شخص نہ خیال کر ۔ اگر کوئی تجھ سے کہے کہ خدا کی خدائی میں مجھ سے یعنی بچارے اُحیمد سے بھی زیادہ کوئی عاجز و ناتوان موجود ہے تو اُس کا اعتبار نہ کر ۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ '' اللہ مجھ پر اور تجھ پر راستہ آسان کرے اور ہمیں اور تجھے اور مسلمانوں کو برگزیدہ نیکوں اور صاحب خلوص اچھوں اور اللہ و رسولؐ کے دوستوں میں شامل کرے اور اُسی اللہ کی دوستی بس ہے ۔ و الحمد للہ رب العالمین ۔

اقبال اور مولوی احمد دین

مشفق خواجہ

جب آفتاب اُبھرتا ہے تو ستارے باوجود اپنی تمام تابانیوں اور درخشانیوں کے ماند پڑ جاتے ہیں ۔ آفتاب ستاروں کے وجود کو ختم نہیں کرتا بلکہ اپنے لامتناہی سلسلۂ نور کو روشنی کے دیگر ذرائع پر اس حد تک حاوی کر دیتا ہے کہ بظاہر صرف اسی کا وجود دیکھنے والوں کی نگاہوں کے سامنے رہتا ہے ۔ اقبال کی عظمت نے اپنے بیشتر دوستوں اور رفیقوں کے ساتھ کچھ ایسا ہی سلوک کیا ۔ اقبال کے بعض دوست اگرچہ اپنی انفرادیت کے دیرپا نقوش چھوڑ گئے ہیں لیکن بہت سے ایسے بھی ہیں جنھیں آج کوئی نہیں جانتا ، حالاں کہ ان میں سے ہر شخص اپنی ذات سے ایک انجمن تھا ۔

انسان اپنے گرد و پیش کے ماحول اور اپنے قریبی احباب سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ۔ اقبال نے بھی اپنے ان دوستوں سے بہت کچھ حاصل کیا لیکن وقت کے ظالم ہاتھوں نے روشنی کے ان بہت سے منابع کو نظروں سے اوجھل کر دیا جن سے اقبال کے آفتاب عظمت نے کسب ضیا کیا تھا ۔ ''بزم اقبال'' علامہ کے ایسے ہی دوستوں اور رفیقوں کی داستان ہے ، جو گمنام ہیں ، ان کے بارے میں تفصیل سے لکھا جائے گا اور اس بزم کے جو اراکین علمی و ادبی حلقوں میں اچھی طرح روشناس ہیں ، ان کی زندگی کا صرف وہی پہلو پیش کیا جائے گا جو اقبال کی ذات سے وابستگی کا شرف رکھتا ہے ۔

مولوی احمد دین کی داستان حیات اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے ۔ مولوی صاحب اپنے عہد کی بلند پایہ شخصیات میں سے تھے اور ان کی کم از کم ایک کتاب ''سرگزشت الفاظ'' تو اردو کے ادب عالیہ میں شمار ہوتی ہے ۔ اردو زبان سے دل چسپی رکھنے والوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس کی نظر سے یہ کتاب نہ گزری ہو ، لیکن اس کے مصنف کے بارے میں آج کوئی کچھ نہیں جانتا ۔ مولوی صاحب کے مفصل حالات زندگی عام طور پر معلوم نہیں ہیں ، اُردو ادب کی تاریخوں میں کہیں ان کا ذکر نہیں ملتا ۔ بعض مضامین اور دو ایک کتابوں میں اقبال کے ''دوست'' کی حیثیت سے ان کا تذکرہ ضرور آیا ہے ، لیکن ان سے مولوی صاحب کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات حاصل نہیں ہوتیں ۔ محمدالدین فوق نے ''تاریخ اقوام کشمیر'' میں گنتی کی چند سطریں لکھی ہیں ۔ ''نقوش'' کے لاہور

نمبر میں مولوی محمد اسماعیل پانی پتی نے بھی انھیں باتوں کو دھرا دیا ہے۔
مولوی صاحب کے خاندان کے جو افراد بقید حیات ہیں ، ان کی معلومات بھی بہت محدود ہیں نیز مولوی صاحب کا کتب خانہ اور ذاتی کاغذات بھی دستبرد زمانہ سے محفوظ نہیں رہے ۔ ایسی صورت میں مولوی صاحب کی داستان حیات کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنا ممکن نہیں ہے ۔ مختلف بکھرے ہوئے اشارات اور بعض عینی شاہدوں کی بیان کردہ روایات کے سہارے مولوی صاحب کی روداد زندگی پیش کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے ۔ یہ مربوط و مسلسل داستان نہیں ، صرف ایک ادھورا سا خاکہ ہے جسے مکمل کرنے کے لیے مزید تحقیق اور چھان بین کی ضرورت ہے ۔

ابتدائی حالات : مولوی احمد دین کشمیری الاصل تھے ۔ ان کا تعلق کشمیر کی ''لون'' قوم سے تھا ۔ اس قوم کے متعلق محمد دین فوق نے ''تاریخ اقوام کشمیر'' میں تفصیل سے بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ''لون'' ہندوؤں کا ایک قدیم جنگ جو طبقہ ہے جو ملکی نظم و نسق میں ایک طویل عرصے تک دخیل رہا ہے ۔ اس قوم کے مشرف بہ اسلام ہونے کے بارے میں فوق صاحب لکھتے ہیں :

''لون طبقہ کس زمانے میں مشرف بہ اسلام ہوا ؟ اس کے متعلق قیاساً ہی کہا جا سکتا ہے کہ کچھ لوگ حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی کے کشمیر آنے سے پیشتر اور بہت زیادہ ان کے قیام کشمیر کے دوران میں دیگر اقوام کے ساتھ مسلمان ہو گئے ہیں''۔[۱]

اس قوم کے بہت سے خاندان کشمیر سے نقل مکانی کرکے پنجاب کے مختلف علاقوں میں آباد ہو گئے تھے ۔ مولوی احمد دین کا خاندان بھی انھیں میں سے ہے ۔ مولوی صاحب کے دادا کشمیر سے پنجاب میں آئے اور لاہور کو انھوں نے اپنا مسکن بنایا ۔ مولوی صاحب کے دادا کے متعلق کسی قسم کی معلومات حاصل نہیں ہو سکیں ۔ ان کے نام ، پیشے اور لاہور آنے کے زمانے کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا ۔ مولوی صاحب کے والد کا نام اللہ دین تھا ۔ انھوں نے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی تھی اور لاہور جیل میں تعینات تھے ۔

مولوی احمد دین ۱۸۶۵ع میں پیدا ہوئے ۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم گوجرانوالہ میں حاصل کی ۔ ان کی تعلیم کا آغاز ایک مسجد کے مکتب میں ہوا ۔ اس کے بعد وہ لاہور آ گئے ، یہاں سنٹرل ماڈل اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا ، گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہو گئے اور یہیں سے بی ۔ اے کی سند لی ۔ بعد ازاں اسی

۱۔ ''تاریخ اقوام کشمیر'' جلد اول صفحہ ۲۸۳ ، دوسرا ایڈیشن ، مطبوعہ لاہور ، ۱۹۳۴ع ۔

کالج میں ایم ۔ اے (انگریزی) میں داخلہ لیا لیکن جلد ہی انھوں نے ایم ۔ اے کرنے کا خیال ترک کر دیا اور قانون کی تعلیم کی طرف توجہ کی اور اس امتحان میں کام یابی حاصل کی ۔

مولوی صاحب ابتدا ہی سے نہایت ذہین تھے ۔ بی ۔ اے کے امتحان میں انھوں نے درجہ اول میں کام‌یابی حاصل کی جس کے صلے میں انھیں طلائی تمغا ملا ۔ گورنمنٹ کالج میں مولوی صاحب کو اردو کے عظیم انشاء پرداز مولوی محمد حسین آزاد کی شاگردی کی سعادت نصیب ہوئی ۔ آزاد سے مولوی صاحب بے انتہا متاثر ہوئے اور اسی تعلق نے ان میں ادب کا صحیح ذوق پیدا کیا ۔ آزاد نے مولوی احمد دین کی ادبی شخصیت کو بنانے میں جو حصہ لیا ہے ، اس کا اظہار مولوی صاحب کی تصانیف سے بخوبی ہوتا ہے ۔ خصوصاً انھوں نے آزاد کے اسلوب کو اپنانے کی جو کوشش کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے ۔

مولوی احمد دین نے قانون دان کی حیثیت سے ایک ممتاز مقام حاصل کیا دیوانی معاملات میں انھیں کمال حاصل تھا ۔ ان کی قانونی قابلیت کے اقبال بھی معترف تھے اور جیسا کہ آگے چل کر ذکر آئے گا وہ قانونی معاملات میں ان سے مشورہ کرتے رہتے تھے ۔

انجمن حمایت الاسلام : مولوی احمد دین کی صلاحیتیں صرف اپنے پیشہ وارانہ فرائض تک ہی محدود نہ تھیں ۔ وہ سماجی اور ادبی تحریکوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس صدی کے ربع اول میں لاہور کی جن چند شخصیات کو سماجی و ادبی اعتبار سے بلند مقام حاصل تھا ، ان میں مولوی صاحب کا بھی شمار تھا ۔ انجمن حمایت الاسلام سے ان کا گہرا تعلق تھا ۔ وہ ایک عرصے تک انجمن کی اسکولز سب کمیٹی اور تالیف و طبع سب کمیٹی کے سکریٹری رہے ۔ نیز سالہا سال تک اسلامیہ کالج لاہور کے سکریٹری کی خدمت بھی انھی کے ذمہ رہی ۔ جن کارکنوں کی بدولت انجمن کو ایک قومی ادارے کی حیثیت حاصل ہوئی ہے ان میں مولوی صاحب کا نام سر فہرست ہے ۔

مولوی صاحب انجمن کے سالانہ اجلاسوں میں بھی تقریریں کرتے اور مقالے پڑھتے تھے۔ انجمن کے انیسویں سالانہ اجلاس کی روداد میں ، جو ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی تھی ، مولوی صاحب کا ایک مضمون بہ عنوان ''راز و نیاز'' شامل ہے ۔ اس مضمون پر مرتب روداد نے یہ نوٹ دیا ہے :

دوسرا لیکچر موسوم بہ 'راز و نیاز' انجمن کے ایک معزز کارکن مولوی احمد دین صاحب بی اے پلیڈر کا تھا ۔ گو مولوی صاحب کے ساتھ پبلک نے وہ سلوک نہیں کیا جو مولوی الف دین صاحب کے ساتھ برتا تاہم نہایت افسوس ہے کہ ان کا عمدہ اور

بے مثال لیکچر بھی ادھورا رہا اور پورا نہ ہونے پایا ۔ یہ لیکچر بھی شامل روداد ہے ۔[1]

۱۹۰۸ء میں انجمن میں اندرونی خلفشار پیدا ہوا اور اس کے اراکین دو مختلف گروہوں میں تقسیم ہو گئے تو ۳ مئی ۱۹۰۸ء کو دونوں گروہوں کے پانچ پانچ وکلاء نے مل کر آپس میں تمام اختلافات کو ختم کیا ۔ ان وکلاء میں مولوی احمد دین بھی شامل تھے ۔ اخبار ''وطن'' لاہور کی ۱۵ مئی ۱۹۰۸ء کی اشاعت میں اس مصالحتی اجلاس کی جو رپورٹ شائع ہوئی ہے ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب ''طالب اصلاح'' گروہ کے وکیل تھے ، دوسرا گروہ مخالف اصلاح تھا ۔

انجمن کے ایک ایسے ہی تنازعے کا ذکر مولانا عبدالمجید سالک نے بھی کیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

''. . . . . انجمن میں اختلافات و تنازعات بہت بڑھ گئے تھے اور مقدمہ بازی تک نوبت پہنچ گئی تھی ۔ ''پیسہ اخبار'' ۳۰ اپریل ۱۹۱۰ء میں ایک اطلاع درج ہے کہ ۲۲ اپریل کی شام کو نواب فتح علی خان قزلباش کے دولت کدے پر آنریبل محمد شفیع ، ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ، مولوی احمد دین ، شیخ گلاب دین ، مولوی محبوب عالم ، میاں فضل حسین ، چوہدری نبی بخش ، مولوی فضل الدین ، میاں نظام دین اور مولوی کریم بخش جمع ہوئے . . . . . ۔''[2]

انجمن کشمیری مسلمانان : انجمن کشمیری مسلمانان سے بھی مولوی صاحب کا گہرا تعلق تھا ۔ وہ اس کے بانیوں میں سے تھے ۔ یہ انجمن ان کشمیری مسلمانوں نے قائم کی تھی جو کشمیر سے نکل کر پنجاب میں مستقل طور پر آباد ہوئے تھے اور اس کا مقصد کشمیری مسلمانوں کی فلاح و بہبود تھا ۔ اقبال بھی اس انجمن کے کاموں میں دلچسپی لیتے رہتے تھے ۔ محمد عبداللہ قریشی نے ''حیات اقبال کی گم شدہ کڑیاں'' کے عنوان سے سہ ماہی ''اقبال'' لاہور بابت اپریل ۱۹۵۶ء میں اقبال اور انجمن کشمیری مسلمانان کے تعلق پر تفصیل سے لکھا ہے اور یہ بتایا ہے کہ جب ڈھاکے کے نواب خواجہ سلیم اللہ امرت سر آئے تو ۲۸ دسمبر ۱۹۰۸ء کو ان سے انجمن کا ایک وفد ملا تھا ۔ مولوی احمد دین بھی اس وفد میں شامل تھے ۔

لاہور کی ادبی محفلیں : مولوی صاحب کی ادبی زندگی کا آغاز کالج کے زمانے ہی سے ہو چکا تھا لیکن اس ذوق کی جلا حکیم امین الدین کے مکان پر منعقد ہونے والی ادبی محفلوں میں ہوئی ۔ ان محفلوں کو ساٹھ ستر سال پہلے کے لاہور کی ادبی

۱۔ راقم الحروف نے اس مضمون کو انجمن ترقی اردو پاکستان کے ترجمان ماہنامہ ''قومی زبان'' کی اشاعت بابت ستمبر ، ۱۹۶۶ء میں بھی شائع کرا دیا ہے ۔

۲۔ ''ذکر اقبال'' شائع کردہ ''بزم اقبال'' لاہور ، ۱۹۵۵ء ، ۷۹ - ۸۰ ۔

اور سماجی سرگرمیوں کا مرکز سمجھنا چاہیے - ۱۸۹۵ع میں حکیم احمد شجاع کے والد حکیم شجاع الدین نے ایک ماہانہ مشاعرے کی داغ بیل ڈالی - یہ مشاعرہ حکیم امین الدین کے مکان پر منعقد ہوتا تھا اور اس کی کارروائی ماہانہ گلدستہ ''شور محشر'' میں شائع ہوتی تھی -[۱] ''شور محشر'' کے پہلے شمارے میں جو کارروائی شائع ہوئی تھی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلا مشاعرہ ۳۰ نومبر ۱۸۹۵ع کو منعقد ہوا تھا - اس میں لاہور کے تمام ممتاز اہل علم اور شعرا نے شرکت کی تھی - مولوی احمد دین بھی اس میں شریک ہوئے - مشاعروں اور ادبی ہنگاموں کا یہ سلسلہ ۱۹۲۲ع تک قائم رہا -[۲] مولوی احمد دین باقاعدگی سے ان محفلوں میں شریک ہوتے رہے - خود مولوی صاحب نے ایک جگہ ان ادبی محفلوں کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے :

''انیسویں صدی عیسوی کا آخری عشرہ نصف کے زیادہ گزر چکا تھا - شہر لاہور کے بھاٹی دروازہ کے اندر بازار حکیماں میں ایک مشاعرے کی طرح ڈالی گئی - مجلس مشاعرہ حکیم امین الدین صاحب بیرسٹر مرحوم کے مکان پر جو اسی خاندان حکیماں کے ایک نامور رکن تھے ، جن کے نام پر بازار مشہور ہے ، منعقد ہوا کرتی تھی - میر مجلس اسی خاندان کے بزرگ حکیم شجاع الدین صاحب مرحوم تھے - میرزا ارشد گورگانی دہلوی و میر ناظر حسین ناظم لکھنوی مشاعرے کی روح و رواں تھے - دونوں حضرات خود بھی شعر کہہ کر لاتے تھے اور ان کے شاگردوں اور ثنا خوانوں کی ایک دوسرے کے مقابلے میں طبع آزمائیاں مشاعرے کی رونق کو دوبالا کرتی تھیں - دلی اور لکھنؤ کے اکھاڑے تھے - تماشائیوں کا ایک اچھا خاصا جمگھٹا ہوتا تھا - کالجوں کے نوجوان طالب علم بھی شعر گوئی اور شعر فہمی کے شوق میں چلے آتے تھے اور سخن دانی کی داد لینے اور دینے میں کسی سے پیچھے نہ رہتے تھے -''[۳]

حکیم امین الدین کے مکان کے مشاعروں کے علاوہ اس زمانے میں دوسرا بڑا ادبی مرکز حکیم صاحب کے چچا زاد بھائی حکیم شاہباز دین کا مکان تھا - اس کی کیفیت بھی مولوی احمد دین ہی کی زبانی سنیے :

''. . . . . اس مکان کے سامنے جہاں مشاعرہ ہوتا تھا ایک چھوٹا سا مکان ہے - اس کے مالک حکیم شاہباز دین مرحوم امین الدین صاحب کے چچا زاد بھائی

۱- لاہور کی چیلسی - حکیم احمد شجاع ''نقوش'' لاہور جنوری ۱۹۶۶ع ، صفحہ ۳۱ -
۲- ایضاً ، صفحہ ۱۶ -
۳- ''اقبال'' از احمد دین ، مطبوعہ لاہور ۱۹۲۶ع ، صفحہ ۱ -

اس میں رہتے تھے ۔ آپ نہایت ہی دبلے پتلے آدمی تھے لیکن اللہ میاں نے اس مختصر سے جسم میں ایک ایسا دل رکھ دیا تھا جو اسلامی اخوت اور محبت کے جوش سے ہر وقت لبریز رہتا تھا ۔ خاطرداری اور مہمان نوازی ان کا شیوہ اور خدمت اور ہمدردی ان کی جبلت تھی ۔ ان کے فضائل حسنہ نے ان کے مکان کو ایک کلب گھر بنا دیا تھا ۔ شہر کے با مذاق اصحاب یہاں جمع ہوتے تھے ۔ حکیم صاحب کی چاہ اور چائے اور اہل محفل کی نکتہ سنجیاں قومی تحریکوں میں دل چسپی لینے والوں کو اس مکان پر کشاں کشاں لیے آتی تھیں ۔''[1]

ان ادبی صحبتوں میں مولوی صاحب نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ۔ ان محفلوں میں جو لوگ باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے ''ان میں مولوی احمد دین ، شیخ گلاب دین ، مفتی عبداللہ ٹونکی ، مولانا محمد حسن جالندھری ، مولوی اصغر علی روحی ، سید محمد شاہ وکیل ، سر عبدالقادر ، سر شہاب الدین ، سر محمد اقبال ، خواجہ رحیم بخش ، خواجہ کریم بخش ، خواجہ امیر بخش[2] ۔ خلیفہ نظام الدین اور ماسٹر مولا بخش کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں ۔ اس محفل احباب میں کبھی کبھی سر محمد شاہ دین ، سر محمد شفیع ، فقیر افتخار الدین اور مرزا سلطان احمد بھی آ پہنچتے تھے ۔''[3] پیسہ اخبار والے مولوی محبوب عالم بھی ان محفلوں میں باقاعدگی سے شرکت کرتے تھے ۔ انھی محفلوں میں مولوی احمد دین کی ملاقات ایسے لوگوں سے ہوئی جنھوں نے مولوی صاحب کی علمی و ادبی سرگرمیوں کے لیے راستہ ہموار کیا ۔

صحافت : مولوی صاحب کی ادبی و علمی زندگی کا باقاعدہ آغاز ''پیسہ اخبار'' سے وابستگی کے بعد ہوا ۔ اگرچہ اس اخبار سے تعلق کی تفصیلات معلوم نہیں ہو سکیں لیکن یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ مولوی صاحب نے اسی اخبار سے وابستہ ہو کر صحافت کی تربیت حاصل کی ۔ اس سلسلے میں پھول‌چند کا پنجاب کی صحافت سے متعلق مضمون ہماری معلومات کا واحد ذریعہ ہے ۔ وہ لکھتا ہے :

M. Mahbub Alam has generally been called ایڈیٹر گر ایڈیٹر i.e., editor-making editor. This is a happy appellation, since the *Paisa Akhbar* was a varitable training ground for many of the future editors

۱۔ ''اقبال'' از احمد دین ، مطبوعہ لاہور ، ۱۹۲۶ع ، صفحہ ۲ ۔

۲۔ یہ تینوں خواجہ صاحبان سگے بھائی تھے اور مولوی احمد دین کے قریبی عزیز تھے ۔

۳۔ لاہور کی چیلسی ، حکیم احمد شجاع ''نقوش'' لاہور ، جنوری ۱۹۶۶ع ، صفحہ ۳۱ ۔

of the province. The names of Lala Dina Nath, later the editor of the *Hindustan*, Hakim Ghulam Nabi, later the editor of *Al-Hukma*, Munshi Ahmed Din, later the editor of the *Gham-Khwar-i-Alam*, Mohammad-ud-Din Fauq, later the editor of the *Kashmiri*, Maulvi Shuja-Ullah, later the editor of the *Millat*, stand out prominent among those who had served their apprenticeship in this training school.[1]

مولوی صاحب کی سب سے پہلی کتاب ''ابو المظفر محی الدین اورنگ زیب'' پیسہ اخبار ہی کی طرف سے شائع ہوئی تھی ۔ اس ادارے کی طرف سے ان کی ایک دوسری کتاب ''افواج دنیا'' ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی تھی ۔

خیال ہے کہ مولوی صاحب ''پیسہ اخبار'' سے ۱۹۰۳ء میں یا اس سے پہلے ہی علیحدہ ہو گئے تھے ۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے ، مولوی صاحب کی تصانیف بھی ''پیسہ اخبار'' کی طرف سے شائع ہوئی تھیں ، لیکن ۱۹۰۲ء کی مطبوعہ ایک کتاب ''اسرار حرم'' ایسی بھی ہے جو ایک دوسرے ادارے (رام کشن جنرل بک مرچنٹ) کی طرف سے شائع ہوئی تھی ۔ اس وجہ سے یہ خیال کرنا بے جا نہیں کہ انھوں نے ''پیسہ اخبار'' سے علیحدہ ہونے کے بعد ہی ایک دوسرے ناشر سے رجوع کیا ۔

پھول چند کے مذکورہ اقتباس میں ''غم خوار عالم'' کا ذکر ہے لیکن اس نے اس اخبار کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں دی ۔ مولوی احمد دین نے اپنی ایک کتاب ''جلال الدین محمد اکبر کے دیباچے کے آخر میں اپنے نام کے ساتھ ''سابق ایڈیٹر اخبار غم خوار عالم'' لکھا ہے ۔ یہ کتاب اردو اخبار سے وابستگی کے زمانے میں شائع ہوئی تھی ۔ ''اردو اخبار'' سے مولوی صاحب کا تعلق[2] ۱۹۱۶ء یا اس سے پہلے قائم ہو چکا تھا ، اس لیے ''غم خوار عالم'' کے اجراء کا زمانہ ۱۹۰۳ء اور ۱۹۱۵ء کے درمیانی عرصے کو قرار دیا جا سکتا ہے اس اخبار کا کوئی پرچہ پاکستان کے کسی کتب خانے میں محفوظ نہیں ہے ، اس لیے اس

۱- Journal of the Panjab University and Historical Society. Vol. II, Part I, April, 1933, p. 38.

۲- اس سلسلے میں ایک اور امر بھی قابل لحاظ ہے ۔ اخبار ''وطن'' کے ۱۹۰۸ء کے متعدد شماروں میں ''مہاتما بدھ'' ، ''ابوالفضل'' ، ''رنجیت سنگھ'' کی سوانح عمریوں کا اشتہار ملتا ہے ۔ اس اشتہار میں مصنف کا نام درج نہیں ۔ قیاس ہے کہ یہ مولوی احمد دین ہی کی تصانیف کا اشتہار ہے ۔ اس اعتبار سے مولوی صاحب کا ''اردو اخبار'' سے ۱۹۰۸ء سے قبل وابستہ ہونا تسلیم کیا جا سکتا ہے ۔ اس بنا پر ''غم خوار عالم'' کے اجراء کا زمانہ ۱۹۰۳ء اور ۱۹۰۸ء کا درمیانی عرصہ قرار دینا چاہیے ۔

کے بارے میں کسی قسم کی معلومات پیش کرنا ممکن نہیں ہے ۔

''اردو اخبار'' سے مولوی صاحب کی وابستگی کی اطلاع ان کی تصانیف ''حیات ٹوڈرمل'' اور ''جلال الدین محمد اکبر'' سے ملتی ہے ۔ ان دونوں کتابوں کے سرورق پر ان کے نام کے ساتھ ''ملازم دفتر اردو اخبار'' لکھا ہے ۔ عبداللہ قریشی صاحب کا بیان ہے کہ منشی محمد الدین فوق اس اخبار کے ایڈیٹر تھے ۔[1] یہ اخبار منشی رام اگروال تاجر کتب لاہور جو کتب خانہ تعلیمی پنجاب کے مہتمم تھے ، شائع کرتے تھے ۔ ''حیات ٹوڈرمل'' کے سرورق پر اس اخبار کا مندرجہ ذیل اشتہار درج ہے ۔ اس سے اخبار کی نوعیت کا اندازہ ہو سکتا ہے :

''اس کتب خانے سے اردو اخبار ہفتہ وار شائع ہوتا ہے جس میں دلچسپ اور مفید مضامین تازہ بتازہ خبروں کے علاوہ شعر و سخن ، دل خوش کن لطائف و ظرائف اور عقل کے کرشمے یعنی حل طلب معمے (بعض انعامی معمے) بھی درج ہوتے ہیں ۔ قیمت سالانہ مع محصول ڈاک صرف ایک روپیہ آٹھ آنے ہے ۔ نقد قیمت ادا کرنے سے ایک روپے کے انعامی ناول اصلی قیمت پر (صرف انعامی ناولوں مندرجہ حاشیہ اخبار میں سے) مفت ملتے ہیں ۔ اخیر سال کو خریداروں میں کئی قسم کے نقدی انعام بھی تقسیم ہوتے ہیں ۔ یہ اخبار بعض صورتوں میں مفت بھی مل سکتا ہے ۔ مفصل حالات و شرائط کے لیے نمونہ کا پرچہ مفت طلب فرما کر ملاحظہ فرمائیں ۔''

اس اخبار کے ادارے کی طرف سے کتابیں بھی شائع کی جاتی تھیں ۔ مولوی صاحب کی بیشتر تصانیف اس ادارے نے شائع کی ہیں ۔

''غم خوار عالم'' اور ''اردو اخبار'' کے سلسلے میں اردو صحافت سے متعلق کوئی کتاب ہماری رہنمائی نہیں کرتی ۔ ایک آدھ جگہ ان اخباروں کا نام ضرور آیا ہے لیکن وہ بھی پھول چند کے بیان کی صدائے باز گشت ہے ۔ پھول چند کی دی ہوئی اطلاع پر کسی نے کوئی اضافہ نہیں کیا ۔

وفات : حکیم احمد شجاع کے بیان کے مطابق ، مولوی صاحب زندگی کے آخری چند برسوں میں مسلسل بیمار رہے اور پاؤں کے چنبل کی وجہ سے وہ گھر سے باہر نہ نکل سکتے تھے ۔ اسی عالم میں آخرکار انھوں نے ایک کام یاب زندگی گزارنے کے بعد چونسٹھ سال کی عمر میں ۱۱ اکتوبر ، ۱۹۲۹ع مطابق

۱۔ مکتوب بنام راقم الحروف مورخہ ۷ فروری ۱۹۶۶ع ۔

۶ جمادی الاول ، ۱۳۴۸ ہجری کو وفات پائی[1] اور انہیں میانی صاحب کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا ۔

شخصیت : مولوی صاحب کی شخصیت بڑی پر کشش تھی ۔ ان کی وضع داری ضرب المثل تھی ۔ ان کی ذات قدیم تہذیب کا بہترین نمونہ تھی ۔ آج بھی بہت سے ایسے لوگ موجود ہیں جنھوں نے مولوی صاحب کو بہت قریب سے دیکھا تھا اور جن کے ذہن میں ان کی بہت سی یادیں محفوظ ہیں ۔ راقم الحروف کے نام ایک خط میں حکیم احمد شجاع لکھتے ہیں :

''مولوی احمد دین ، مولوی تاج الدین اور میرے عم زاد بھائی حکیم امین الدین نے ایک دایہ کا دودھ پیا تھا اور اس لیے ان تینوں بزرگوں کی آپس میں بھائیوں بھائیوں کی سی محبت تھی . . . . میں ذاتی طور پر مولوی احمد دین صاحب کی اس محبت اور شفقت کو کبھی بھول نہیں سکتا جو میرے والد مرحوم کی وفات کے بعد میرے ایام طفولیت سے لے کر اس وقت تک ، جب تک وہ زندہ رہے ، میری زندگی کا بہت بڑا سہارا رہی ۔ میری کام یابی ہر خواہ وہ کسی امتحان میں ہو یا ملازمت کے سلسلے میں انہوں نے ہمیشہ ایسی مسرت کا اظہار کیا کہ ان کا یہ خلوص میرے لیے باپ کے سایۂ عاطفت کا نعم البدل بن گیا ۔''[2]

مولانا غلام رسول مہر مولوی صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں :

میں ۱۹۱۱ع میں بہ سلسلہ تعلیم لاہور آیا تھا ۔ اس زمانے میں مولوی احمد دین مرحوم اقبال کے خاص احباب میں شمار ہوتے تھے ۔ ۱۹۲۴ع میں دوبارہ یہاں آیا تو ان کے اور شیخ گلاب دین کے بارے میں سنا جاتا تھا کہ انھیں مولوی صاحب سے خصوصی تعلق ہے ۔ مولوی احمد دین سے کبھی بات چیت نہیں ہوئی ۔ البتہ انھیں دور سے کئی مرتبہ دیکھا ہے ۔ بالکل کم گوتھے عام روایت یہ تھی کہ سول مقدمات میں انھیں کمال مہارت حاصل ہے ۔ پوشش ہمیشہ سادہ دیکھی ۔ پاجامہ لٹھے کا ، چھوٹا کوٹ ، سر پر ترکی ٹوپی ۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی . . . . اقبال کی ٹوپی بھی ترکی ہوتی مگر ہارڈ ۔ مولوی احمد الدین کی ٹوپی سافٹ اور ذرا سیاہی مائل رنگ کی ہوتی تھی . . . . بہرحال مولوی صاحب بڑے

۱۔ اخبار ''حمایت الاسلام'' لاہور بابت ۷ ، اکتوبر ۱۹۲۹ع (بحوالہ مکتوب جناب عبداللہ قریشی بنام راقم الحروف مورخہ ۱۳ نومبر ۶۶ع) ۔ اس اخبار نے جو اطلاع شائع کی تھی ، اس میں لکھا ہے کہ مولوی صاحب نے ایک مدت کی علالت کے بعد انتقال کیا ۔

۲۔ مکتوب مورخہ ۷ فروری ، ۱۹۶۶ع ۔

متین ، سنجیدہ ، کم گو بزرگ تھے ۔[1]

اولاد : مولوی صاحب نے دو شادیاں کی تھیں ۔ پہلی بیوی سے پانچ لڑکے اور دو لڑکیاں ہوئیں اور دوسری بیوی سے چار لڑکے اور ایک لڑکی ۔ ان میں سے دو لڑکے خواجہ ریاض احمد اور خواجہ امتیاز احمد بفضلہ حیات ہیں ۔ ریاض احمد صاحب اسلامیہ کالج لاہور سے منسلک ہیں ۔ مولوی احمد دین کے ذاتی حالات کے سلسلے میں بعض معلومات انھی سے حاصل ہوئیں ۔ مولوی صاحب کے بڑے صاحب زادے بشیر احمد تھے ۔ ان کے بارے میں مولانا مہر لکھتے ہیں :

"۔ ۔ ۔ ۔ مولوی بشیر احمد شیخ مبارک علی کے پاس برسوں کام کرتے رہے ۔ وہ بھی پیکر خلوص تھے ، بے مثال لطیفہ باز ۔ کھانا پکانے میں ایسے مشتاق تھے کہ میں نے زندگی میں ویسا کوئی نہ دیکھا ۔ ۔ ۔ ۔ تقسیم سے کئی برس بیشتر وفات پائی ۔"[2]

مولوی صاحب کو لاہور سے عشق تھا ۔ وہ اس شہر سے اس حد تک محبت کرتے تھے کہ وہ خود اس کا ایک لازمی جزو بن گئے تھے اور شاید اسی وجہ سے لاہور سے وہ بہت کم باہر نکلتے تھے ۔ البتہ کشمیری الاصل ہونے کی وجہ سے ہر سال ستمبر کے مہینے میں جب کہ عدالتوں کی تعطیلات ہوتی تھیں ، وہ کشمیر ضرور جاتے تھے ۔ لاہور میں پہلے پہل ان کا قیام سوترمنڈی میں تھا ، پھر لوہاری منڈی میں رہے اور آخر میں بازار حکیماں میں لال حویلی کے سامنے کے مکان میں رہے اور یہیں اُن کا انتقال ہوا ۔ وکالت کے سلسلے میں انھوں نے اپنا دفتر لوہاری منڈی میں پھولوں والی گلی کے سامنے کے مکان میں بنایا تھا ۔

اقبال سے تعلقات : مولوی احمد دین اور اقبال کے تعلقات کی داستان دراصل دو ایسے دوستوں کے باہمی ارتباط کی روداد ہے جو آپس میں محبت بھی کرتے تھے اور ایک دوسرے کا احترام بھی کرتے تھے ۔ ان کی دوستی ہر اعتبار سے مثالی تھی ۔ آغاز تعلقات سے لے کر مولوی صاحب کی وفات تک ان دونوں کے تعلقات گہرے رہے ، ایک آدھ مرتبہ شکر رنجی ضرور پیدا ہوئی لیکن وہ بھی حد سے بڑھی ہوئی محبت کا نتیجہ تھی ۔

اقبال مولوی صاحب سے تقریباً بارہ سال چھوٹے تھے ، ظاہر ہے کہ یہ فرق کوئی معمولی فرق نہیں ہے ، لیکن دونوں کے مشترک علمی مذاق نے اس فرق کو بالکل ختم کر دیا تھا اور ویسے بھی دوستی سن و سال کی نہیں ۔ ہم مذاق و ہم مشربی کی پابند ہوتی ہے ۔ ان دونوں میں جو گہرے تعلقات تھے ان کی اور

۱ ، ۲- مکتوب بنام راقم الحروف ، مورخہ ۱۳ مارچ ۱۹۶۶ع ۔

بھی کئی وجوہ تھیں ۔ مثلاً دونوں کشمیری الاصل تھے اور اس طرح قدرتی طور دونوں میں ایک دوسرے کے لیے کشش تھی ۔ اسی بنا پر دونوں نے ''انجمن کشمیری مسلمانان'' کے ذریعے اپنی برادری کی فلاح و بہبود کے لیے کام کیا ۔ دونوں ہم پیشہ تھے اور قانون دان کی حیثیت سے اپنی اپنی جگہ ممتاز حیثیت رکھتے تھے ۔ اقبال کو اپنے ذاتی معاملات میں مولوی صاحب کی قانونی قابلیت سے فائدہ اٹھانے کی بار بار ضرورت پیش آئی اور اس تعلق نے بھی دوستی کی بنیادوں کو مضبوط سے مضبوط تر کیا ۔ دونوں کا ''انجمن حمایت الاسلام'' سے گہرا تعلق تھا اور یہ ادارہ بھی ان کے باہمی تعلقات کو خوشگوار بنانے کا ایک ذریعہ بنا ۔ الغرض مختلف عناصر نے مل کر اقبال اور احمد الدین کو ایک دوسرے سے قریب کیا اور وقت کے ساتھ ساتھ یہ قربت خلوت و جلوت کے ہر مرحلے میں بڑھتی چلی گئی ۔

اس مقالے کی ابتدا میں بازار حکیماں کی ادبی محفلوں کا ذکر آ چکا ہے ۔ انھیں محفلوں میں اقبال اور احمد دین ایک دوسرے سے روشناس ہوئے ۔ یہ ۱۸۹۵ع کا واقعہ ہے ۔ اقبال اس وقت اٹھارہ سال کے ایک طالب علم تھے ، مولوی احمد دین کی عمر تیس سال کی تھی اور وہ عملی زندگی میں نہ صرف داخل ہو چکے تھے بلکہ علمی و ادبی حلقوں میں خاصی شہرت بھی حاصل کر چکے تھے ۔ یہ دونوں ان ادبی محفلوں میں نیز ''انجمن حمایت الاسلام'' کے جلسوں میں باقاعدگی سے شرکت کرتے تھے اس وجہ سے تعلقات میں گہرائی پیدا ہوتی چلی گئی ۔ ان تعلقات کی مدت تقریباً ۴۳ برس ہے ۔ اس عرصے میں اقبال نے ترقی اور شہرت کے بڑے بڑے مدارج طے کیے ۔ اگر یہ کہا جائے کہ اقبال کو متعارف کرانے میں مولوی احمد دین کی کوششوں کو بھی دخل رہا ہے ، تو یہ کچھ بے جا نہ ہوگا ۔ اقبال کی شاعرانہ عظمت پر سب سے پہلے تفصیل سے جس شخص نے لکھا وہ مولوی صاحب ہی تھے ۔

علمی و ادبی معاملات سے قطع نظر دونوں ایک دوسرے کی ذاتی زندگی میں بھی بڑی حد تک دخیل تھے ۔ مولوی صاحب اقبال کی ابتدائی زندگی کے تمام ''خفی و جلی'' پہلوؤں سے پوری طرح واقف تھے ۔ اقبال کے ایک قدیم دوست مرزا جلال الدین بیرسٹر نے ''ملفوظات اقبال'' میں رقص و سرود کی محفلوں سے متاثر ہو کر اقبال کے شعر کہنے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے : ''میری ملاقات سے پیش تر مولوی احمد دین صاحب نے کئی ایسے مواقع کا ذکر کیا ہے ''۔[1] رقص و سرود سے اقبال کی دلچسپی کے سلسلے میں مرزا صاحب لکھتے ہیں : ''. . . میں

۱۔ ''ملفوظات اقبال'' مرتبہ محمود نظامی ، دوسرا ایڈیشن ، مطبوعہ لاہور ، ۱۹۴۹ع ، ۱۰۸ ۔

نے بھی مولوی احمد دین مرحوم سے ان کی داستان سن رکھی تھی ۔''[1] ان بیانات سے مولوی احمد دین اور اقبال کی بے تکلفی نیز تعلقات کی گہرائی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔

اقبال کی دوسری (والدہ جاوید اقبال کے ساتھ) اور تیسری شادی میں جن چھ احباب نے شرکت کی ان میں مولوی احمد دین بھی شامل تھے ۔[2]

جیسا کہ کہا جا چکا ہے اقبال مولوی احمد دین کی قانونی مہارت کے بھی قائل تھے ۔ وہ مقدمات کے سلسلے میں مولوی صاحب کی مدد لیتے رہتے تھے ۔ اس قسم کے ایک مقدمے کا ذکر عبداللہ قریشی صاحب نے کیا ہے ۔ جون ۱۹۲۱ء میں منشی سراج الدین نے ایک معاملے میں قانونی مشورے کے لیے اقبال کو کشمیر بلایا ۔ اقبال اپنے ساتھ مولوی احمد دین کو بھی لے گئے اور ''تقریباً دو ہفتے تک سری نگر میں رہے ۔''[3] مقدمے کے کام سے فراغت حاصل کرنے کے بعد اقبال اور مولوی صاحب نے بہت سا وقت سیر و تفریح میں بھی گزارا ۔

بعض لوگ اقبال کا کلام بلااجازت چھاپ لیتے تھے اقبال نے ایسے لوگوں پر مقدمہ چلانے کا کام مولوی صاحب کے سپرد کر رکھا تھا ۔ بلااجازت کلام چھاپنے والوں میں ایک صاحب منشی قمر الدین تھے ۔ ان صاحب کے بارے میں اقبال ، منشی محمد الدین فوق ، کے نام ۹ مارچ ۱۹۱۲ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں :

''اس سے پیشتر میں اس شخص (منشی قمرالدین) پر مقدمہ دائر کرنے کو تھا مگر مولوی ظفر علی خان کے کہنے پر باز رہا ۔ اس نے اس سے پیشتر میری نظموں کو میری اجازت کے بغیر شائع کر دیا تھا ۔ اب یہ سب معاملہ مولوی احمد الدین وکیل کے سپرد کیا ہے کہ اگر کوئی میرا کلام میری اجازت کے بغیر چھاپے تو اس پر دعویٰ کر دیا جائے ۔''[4]

۱۹۲۲ء کے بعد مولوی احمد دین بقول حکیم احمد شجاع[5] مسلسل بیمار رہے ۔ اس عرصے میں اقبال ، مولوی صاحب کی مزاج پرسی کے لیے ان کے مکان پر جو بھاٹی دروازے میں تھا ، آتے رہے ۔ جب مولوی صاحب کا انتقال ہوا تو اقبال پاؤں کی تکلیف کی وجہ سے جنازے میں شرکت نہ کر سکے ۔ انھوں نے

۱۔ ملفوظات اقبال ، ۱۳۳ ۔
۲۔ ''ذکر اقبال'' از سالک ، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۵ء ، ۶۸ ، ۶۹ ۔
۳۔ ''اقبال اور کشمیر'' از عبداللہ قریشی ، سہ ماہی ''اقبال'' لاہور اکتوبر ۱۹۵۶ء ، ۲۹ ۔
۴۔ ''نقوش'' لاہور ، مکاتیب نمبر جلد اول ، ۲۹۶ ۔
۵۔ مضمون لاہور کی چیلسی ''نقوش'' لاہور ، جنوری ۱۹۶۶ء ، ۵۱ ۔

مولوی صاحب کے فرزند خواجہ بشیر احمد کے نام جو تعزیتی خط لکھا تھا ، وہ یہ ہے :[1]

11-10-29

عزیزم بشیر ، السلام علیکم !

افسوس ہے کہ میں مولوی صاحب مرحوم کے جنازے میں شریک نہ ہو سکا ۔ مجھے اس سے دو ایک روز پہلے نقرس ہو گیا جس کی وجہ سے پاؤں میں سخت تکلیف تھی ۔ حرکت سے قاصر رہا ۔ دوسرے روز دانت کے درد کا بھی اضافہ ہو گیا ۔ میں نے خواجہ صاحب (خواجہ فیروز دین[2] کے ہم دست آپ کو اپنی معذوری کا پیغام بھیجا تھا ۔ معلوم نہیں کہ وہ پیغام آپ تک پہنچا کہ نہ پہنچا ۔ بہرحال مجھے یہ افسوس تازیست رہے گا کہ مرحوم کے لیے آخری دعا جو کی گئی ۔ میں اس میں شریک ہونے سے محروم رہا ۔ خدا تعالیٰ ان کو غریق رحمت کرے اور آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے کل آپ کے ہاں حاضر ہونے کا قصد تھا مگر اس سے پہلے انجمن کے جلسے میں دیر ہو گئی ۔ انشاء اللہ اب حاضر ہوں گا ۔ اُمید ہے شام کے قریب آپ سب بھائی گھر پر ہوتے ہوں گے ۔ زیادہ کیا عرض کروں سوائے دعائے صبر جمیل کے ۔ والسلام ! محمد اقبال

اقبال اور مولوی احمد دین کی دوستی کے بارے میں حکیم احمد شجاع لکھتے ہیں :

''اقبال اور مولوی احمد دین کے تعلقات بہت قریبی تھے اور مخلصانہ . . . . مولوی صاحب اقبال سے دلی محبت رکھتے تھے اور ان کے کلام سے ان کو بڑا لگاؤ تھا ۔ اقبال بھی اگرچہ مولوی صاحب سے عمر میں بہت چھوٹے نہ تھے ، لیکن ان کا احترام ہمیشہ ملحوظ رکھتے تھے اور جو شعر ان کی پسند کی کسوٹی پر پورا نہ اترے ، اسے یا تو نظر انداز کر دیتے تھے اور یا اس پر دوبارہ غور کرتے تھے ۔ اس کے علاوہ اقبال ہمیشہ اپنے ذاتی معاملات میں مولوی احمد دین سے مشورہ کرتے تھے اور انہیں کے مشورے پر عمل کرتے تھے ۔ کئی معاملات میں یہ مشورے اقبال کے بڑے کام آئے ۔ جب مولوی احمد دین بہت زیادہ علیل ہو گئے اور پاؤں کے چنبل کی وجہ سے چلنے پھرنے کے قابل نہ رہے تو اقبال بلا ناغہ ان

۱۔ یہ خط ہفتہ وار ''ہماری زبان'' علی گڑھ بابت ۸ مئی ۱۹۶۳ع میں شائع ہو چکا ہے ۔ مجھے اس کی نقل جناب عبداللہ قریشی صاحب کے ذریعے دستیاب ہوئی ہے ۔ ''ہماری زبان'' کے مطبوعہ متن میں بعض الفاظ غلط نقل ہوئے ہیں ۔ یہاں قریشی صاحب کا ارسال کردہ متن درج کیا جا رہا ہے ۔

۲۔ خواجہ فیروز الدین اقبال کے ہم زلف ، گہرے دوست اور لاہور کے مشہور بیرسٹر تھے ۔

کی مزاج پرسی کے لیے میکلور روڈ کی کوٹھی سے بازار حکیماں میں آیا کرتے تھے ۔[۱]
مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں : . . . . مولوی احمد الدین مرحوم اقبال کے بڑے ہی مخلص دوست تھے ایسے دوست جیسے آج کل دیکھنے میں نہیں آتے ۔[۲]

اس محبت اور خلوص کے باوصف ایک مرتبہ ان دونوں دوستوں میں شکر رنجی بھی پیدا ہوئی ۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۹۲۳ع میں ''اقبال'' کے نام سے مولوی احمد دین نے ایک کتاب لکھی جس میں اقبال کی شاعرانہ حیثیت سے بحث کی گئی تھی ۔ عام روایت یہ ہے کہ اقبال کو اس کتاب کی اشاعت پسند نہ آئی کیونکہ اس وقت تک ان کا پہلا اُردو مجموعہ کلام ''بانگ ِدرا'' شائع نہ ہوا تھا ۔ ان کا یہ خیال تھا چونکہ اس کتاب میں بہت سا کلام بھی شامل کیا گیا ہے اس لیے یہ مجموعہ' کلام کی اشاعت و فروخت پر اثر انداز ہو سکتی ہے ۔ مولوی احمد دین کو جب اقبال کی ناپسندیدگی کا علم ہوا تو انھوں نے یہ کتاب جلا دی ۔ ۱۹۲۶ع میں یہ کتاب دوبارہ شائع ہوئی ۔ اس سلسلے میں مختلف واقف حال حضرات کے بیانات کا مطالعہ دل چسپی سے خالی نہ ہوگا ۔ مولانا غلام رسول لکھتے ہیں :

''اقبال کے متعلق کتاب مولوی صاحب نے مرتب فرمائی تھی ۔ اس میں ایسی نظمیں بھی شامل تھیں جنھیں اقبال اپنے کلام سے خارج کر چکے تھے ۔ ایک کاپی دیکھ کر غالباً اقبال نے اسی خیال سے ہلکے انداز میں نا پسندیدگی کا اظہار کیا ، بلا واسطہ نہیں بالواسطہ ۔ مولوی صاحب نہایت مخلص دوست تھے ، ان کے خلوص کا تقاضا یہ ہوا کہ سرسری بیان سنتے ہی مزید استفسار یا رو در رو گفتگو کا بھی انتظار نہ کیا اور پوری کتاب جلوا دی ۔ صرف چند کا بیان اس وقت تک تقسیم ہوئی تھیں ۔ پھر ''بانگ درا'' چھپ گئی تو از سر ِ نو کتاب چھاپی جس میں سے وہ کلام بیشتر خارج کر دیا تھا جسے اقبال خود خارج کر چکے تھے ۔ میں نے ایک مرتبہ اصل کاپی بھی دیکھی تھی ۔ میرا احساس یہی تھا کہ اُنھوں نے محض جذبہ' خلوص میں یہ قربانی کر دی ورنہ اس میں خارج کردہ کلام کی زیادہ مقدار شامل نہ تھی ۔ اس سے زیادہ کلام انجمن (حمایت اسلام) کی سالانہ کارروائیوں میں نیز اخباروں اور رسالوں خصوصاً مخزن میں چھپ چکا تھا ۔''[۳]
حکیم احمد شجاع صاحب کی رائے میں اصل واقعہ یوں ہے :

''مولوی احمد دین نے سب سے پہلے اقبال کو ان کے اصلی روپ میں دیکھا

۱۔ مکتوب بنام راقم الحروف ، مورخہ ۷ فروری ۱۹۶۶ع ۔
۲۔ مکتوب بنام راقم الحروف ، مورخہ ۱۳ مارچ ۱۹۶۶ع ۔
۳۔ مکتوب بنام راقم الحروف ، مورخہ ۱۳ مارچ ۱۹۶۶ع ۔

اور آن کی شاعری کو اس کے رنگ میں سمجھا اور ''اقبال'' کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب لکھی اور اس میں اقبال کے وہ تمام اشعار جمع کیے جو بکھرے ہوئے موتیوں کی طرح ابھی کسی لڑی میں نہ پروئے گئے تھے اور پھر ان اشعار کی اس طرز پر تشریح کی جس پر ''مائنڈ اینڈ آرٹ آف شیکسپیئر'' لکھی گئی تھی ۔ یہ کتاب لاہور کے ایک نامور ناشر شیخ مبارک علی نے چھاپی لیکن ابھی یہ کتاب شائع نہ ہوئی تھی کہ اقبال کو اپنے کلام کے مجموعے کو شائع کرنے کا خیال پیدا ہوا اور یہی وہ مجموعہ ہے جس نے بعد میں ''بانگ درا'' کی شکل اختیار کی ۔ مولوی احمد دین نے اس خیال سے کہ ان کی کتاب کی اشاعت سے ''بانگ درا'' کی اشاعت کو نقصان پہنچے گا ، اپنی کتاب خود ہی تلف کر دی اور اس طرح دنیائے ادب ایک بڑی مفید تحقیقی یادداشت سے محروم ہو گئی ۔''[۱]

شیخ مبارک علی صاحب لاہور کی گزشتہ نصف صدی کی علمی و تہذیبی زندگی کے ایک ایک پہلو سے پوری طرح واقف ہیں ۔ اقبال اور دیگر اکابر سے ان کے بہت گہرے مراسم تھے ۔ مذکورہ بیان کے سلسلے میں میں نے ان کی رائے طلب کی تو انھوں نے یہ جواب ارسال فرمایا :

''مولوی احمد دین اور ڈاکٹر اقبال صاحب کے تعلقات ہمیشہ برادرانہ رہے شیخ صاحب (اقبال) کسی اور دوست کے گھر کبھی نہ گئے ۔ صرف مولوی احمد دین کی شخصیت ایسی تھی جہاں ڈاکٹر صاحب کی کسی قدر بے تکلفی تھی ، وہ ان کے ہاں وقتاً فوقتاً جایا کرتے تھے ۔ چنانچہ انھی تعلقات کی بنا پر اور کچھ عقیدت کے تحت مولوی صاحب مرحوم نے ''اقبال'' لکھی جس میں ڈاکٹر صاحب کے حالات زندگی کے علاوہ ڈاکٹر مرحوم کی طویل نظمیں مثلاً ''شکوۂ جواب شکوہ'' ''فریاد امت'' ''طلوع اسلام'' وغیرہ بھی آ گئی تھیں جب وہ کتاب ڈاکٹر صاحب قبلہ کے سامنے پیش کی گئی تو انھوں نے دیکھ کر یہ کہا کہ اس کتاب کے ہوتے ہوئے میرے دوسرے کلام کے مجموعے کی کیا ضرورت ہے ؟ بظاہر وہ ناراض نہ تھے ۔ اس پر مولوی صاحب مرحوم نے اس کتاب کی کل کاپیاں نذر آتش کر دیں کیونکہ ان کو ڈاکٹر صاحب کی طبیعت میں کافی دخل تھا ، وہ نہیں چاہتے تھے کہ اقبال کا دل کسی طرح بھی میلا ہو ۔ جب ڈاکٹر صاحب کو اس واقع کا علم ہوا تو ان کو اس کا کافی صدمہ ہوا ۔ اس کے کچھ عرصے بعد مولوی احمد دین نے اپنی کتاب ''سرگزشت الفاظ'' لکھی جس پر ڈاکٹر اقبال نے سفارش کرکے مبلغ پانچ صد روپے انعام دلوایا . . . . یہ کتاب ''اقبال'' مولوی صاحب نے ہی . . . . چھپوائی . . . . اس کی طباعت وغیرہ کسی چیز میں ہمارے ادارے کا کوئی دخل نہ تھا ۔ صرف ہمارے پاس اس کا کچھ وقت کے لیے اسٹاک رہا اس

۱- لاہور کی چیلسی مطبوعہ ''نقوش'' لاہور ، جنوری ۱۹۶۶ع ، ۲۸ ۔

لیے (بطور تقسیم کنندہ) ہمارا نام اس کتاب پر تھا ۔''[1]

عبداللہ قریشی صاحب نے بھی اس سلسلے میں تفصیل سے لکھا ہے ۔ ان کا بیان اگرچہ قدرے طویل ہے لیکن معاملے کے سب پہلوؤں پر غور کرنے کے لیے اسے نقل کرنا ضروری ہے ، وہ لکھتے ہیں :

''کہتے ہیں کہ اس کتاب میں مولوی صاحب نے اقبال کی شاعری پر بحث کرتے ہوئے ان کی تمام ابتدائی نظمیں اور غزلیں جو انھوں نے از رہ خلوص و محبت جمع کر رکھی تھیں ، شائع کر دی تھیں ۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح یہ منتشر کلام جمع ہو کر دستبرد حوادث سے محفوظ ہو جائے گا اور اقبال خوش ہوں گے کیونکہ اس وقت تک ان کے کلام کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا تھا اور ان کی شاعری پر بھی کوئی مستند کتاب اردو زبان میں نہیں لکھی گئی تھی مگر مولوی صاحب کا خیال غلط نکلا ۔ انھیں مایوسی ہوئی کیوں کہ جب کتاب چھپ کر اقبال کے پاس پہنچی اور شیخ گلاب دین نے اس کے متعلق اقبال کی رائے دریافت کی تو اقبال نے مذاق ہی مذاق میں کہہ دیا کہ میں تو نظر ثانی کے بعد اپنے کلام کا مجموعہ ابھی مرتب ہی کر رہا تھا کہ مولوی صاحب نے ''اقبال'' کو بیچنا بھی شروع کر دیا ، کم از کم وہ میری کتاب کا انتظار کر لیتے ۔

مولوی صاحب نے جب یہ بات سنی تو اس کا کچھ اور ہی مطلب لیا ۔ اقبال کا کلام چھاپ کر اقبال کو نقصان پہنچانا اور جو اشعار ان کے معیار سے گر چکے تھے انھیں محفوظ کر کے اقبال کی شہرت کو بٹا لگانا مولوی صاحب کا مقصد نہ تھا انھوں نے کتاب کی تمام جلدیں اپنے مکان کے صحن میں ڈھیر کر کے ان کو آگ لگا دی ۔ خود کرسی بچھا کر ایک طرف بیٹھ گئے اور جب تک کتاب کا ایک ایک ورق جل کر راکھ نہ ہوگیا وہاں سے نہ ہلے اور گھر پھونک تماشا دیکھتے رہے ۔

اقبال کو اس واقعے کا علم ہوا تو انھوں نے بڑا افسوس ظاہر کیا ۔ مولوی صاحب سے معذرت طلب کر کے ان کو دوبارہ کتاب چھاپنے پر راضی کیا ۔ چنانچہ ''بانگ درا'' کی اشاعت کے دو سال بعد ۱۹۲۶ع میں یہ کتاب از سر نو لکھ کر دوبارہ شائع کی گئی اور اس دفعہ کلام کا بہت سا حصہ حذف کر دیا گیا ، صرف منتخب اشعار پر اکتفا کیا گیا ۔''[2]

مذکورہ بالا بیانات سے ثابت ہوتا ہے کہ اقبال نے کتاب کی اشاعت کو محض اس وجہ سے ناپسند فرمایا تھا کہ اس زمانے میں ''بانگ درا'' کی طباعت کی تیاریاں ہو رہی تھیں ۔ ''اقبال'' میں علامہ کی تقریباً تمام اہم نظمیں شامل تھیں ۔

۱۔ مکتوب بنام راقم الحروف ، مورخہ ۲۸ فروری ۱۹۶۶ع ۔
۲۔ ''حیات اقبال کی گم شدہ کڑیاں ''سہ ماہی'' اقبال'' لاہور ، اکتوبر ۱۹۵۴ع ، ۴۴—۴۶ ۔

ظاہر ہے ایسی صورت میں ''بانگ درا'' کی اشاعت متاثر ہوتی ۔ مولوی احمد دین کی کتاب اقبال سے عقیدت و محبت کا نتیجہ تھی جو انھوں نے کسی تاجرانہ خیال سے شائع نہیں کی تھی ۔ اقبال کی شکایت بھی بے جا نہ تھی ، لیکن مولوی احمد دین کا غصے میں آ کر پوری کتاب کو جلا دینا جہاں ایک طرف ان کی انتہا پسندی کی دلیل ہے وہیں دوسری طرف اس سے اُس محبت و خلوص کا بھی اندازہ ہوتا ہے جو انھیں اقبال کی ذات سے تھا ۔ مندرجہ بالا بیانات میں جزئیات کی حد تک کہیں کہیں اختلاف ہے ، البتہ عبداللہ قریشی صاحب نے بالکل ایک نئی بات لکھی ہے کہ اقبال نے مولوی احمد دین کو ''اقبال فروشی'' کا الزام دیا ۔[۱] اقبال کی ذات سے یہ بدگمانی کسی طرح مناسب نہیں ، ایک دیرینہ دوست اور قدردان کے لیے اقبال کبھی ایسی بات نہیں کہہ سکتے تھے ۔

اس معاملے کا ایک پہلو تحقیق طلب ہے اور وہ یہ کہ جب مولوی احمد دین اور اقبال میں اتنے گہرے مراسم تھے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اقبال کو کتاب کی طباعت کا پہلے سے علم نہ ہو ؟ مولوی احمد دین کو تو اقبال نے اُن لوگوں کے خلاف قانونی کاروائی کرنے پر متعین کر رکھا تھا جو بلا اجازت ان کا کلام شائع کرتے تھے ۔ ایسی صورت میں یہ کیسے ممکن تھا کہ مولوی صاحب خود اُس جرم کا ارتکاب کرتے جس کے سدباب کے لیے انھیں متعین کیا گیا تھا ؟ مولوی صاحب کے فرزند خواجہ ریاض احمد کے بیان سے اس معاملے پر نئی روشنی پڑتی ہے ۔ راقم الحروف کے نام انھوں نے اپنے مکتوب مورخہ ۷ ۲ اپریل ۱۹۶۶ ء میں لکھا ہے :

''شیخ گلاب دین صاحب مرحوم جو والد صاحب کے دوست بھی تھے اور اقبال کے بھی ، انھوں نے والد صاحب کو بتایا کہ یہ کتاب ''اقبال'' کہیں ''بانگ درا'' پر (جو شائع ہونے والی تھی) اثر انداز نہ ہو ۔ والد صاحب نے یہ سنا تو انھوں نے شیخ گلاب دین صاحب سے کہا کہ ان کا مقصد کتاب لکھنے کا یہ ہرگز نہیں کہ اقبال کو کسی قسم کا نقصان ہو ، اس لیے انھوں نے اس کتاب کو صحن میں رکھ کر بالکل جلا دیا ۔''

ریاض صاحب کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے کتاب کی اشاعت پر ناراضگی کا اظہار نہیں کیا بلکہ شیخ گلاب دین مرحوم کے سمجھانے پر مولوی صاحب نے کتاب کو جلایا ۔ یہ بیان چونکہ مولوی صاحب کو بے حد قریب سے جاننے والے ایک شخص کا ہے ، اس لیے اسے قبول کرنے میں تامل نہیں ہونا چاہیے ۔ اس بیان کی روشنی میں اقبال کتاب کو جلائے جانے کا سبب قرار نہیں دیے

۱ ۔ یہ بات نہیں ۔ عبداللہ قریشی نے صرف اس کتاب کے بیچنے کا ذکر کیا ہے جو ''اقبال'' کے نام سے شائع ہوئی تھی ۔

جا سکتے ۔ اقبال کو یقیناً اس کتاب کے ضائع ہونے پر افسوس ہوا ہوگا ، جبھی تو انھوں نے اصرار کرکے اس کتاب کو دوبارہ چھپوایا ۔ اگر یہ کتاب اقبال کی ناپسندیدگی کی وجہ سے مولوی صاحب نے جلائی ہوتی تو وہ دوبارہ کبھی اسے شائع نہ کرتے ۔

اس تاریخی کتاب کے ضائع شدہ ایڈیشن کا صرف ایک نسخہ باقی ہے جو خواجہ ریاض احمد کے پاس ہے ۔ کاش یہ تاریخی یادگار قومی عجائب گھر یا ''اقبال اکیڈمی'' میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائے ۔

علمی و ادبی خدمات : مولوی احمد دین کی ساری زندگی علم و ادب کی خدمت میں گزری ۔ انھوں نے اردو زبان کو بہت کچھ دیا ۔ اس زبان پر ان کے بے شمار احسانات ہیں ۔ محمد حسین آزاد کے بعد جس صاحب قلم نے لسانیات اور خصوصاً تحقیق الفاظ پر مفصل بحث کی ، وہ مولوی صاحب ہی تھے ۔ ان کی کتاب ''سرگزشت الفاظ'' اس موضوع پر پہلی کامیاب کوشش ہے ۔ اردو تنقید میں سائنٹیفک انداز سب سے پہلے انھوں نے ہی اختیار کیا ۔ ''اقبال'' جہاں ایک طرف علامہ کے فن کا پہلا کامیاب تجزیہ ہے ، وہیں دوسری طرف اردو ادب میں بھی عملی تنقید کا پہلا کامیاب نمونہ ہے ۔ سیرت و سوانح میں بھی مولوی صاحب نے قابل قدر کارنامے چھوڑے ہیں ۔ خصوصاً اورنگ زیب عالم گیر پر ان کی کتاب اس اعتبار سے اولیت رکھتی ہے کہ اس میں پہلی مرتبہ اورنگ زیب کا مدلل دفاع پیش کیا گیا ہے ۔ مولوی صاحب کی ان علمی و ادبی خدمات پر علیحدہ علیحدہ بحث کرنے کی بجائے ان کی تمام تصانیف کا جائزہ آئندہ سطور میں پیش کیا جائے گا اور اس سے معلوم ہوگا کہ ماہر لسانیات ، نقاد اور سوانح نگار کی حیثیت سے ان کا کیا درجہ ہے ۔

مضمون نگاری : مضمون نگار کی حیثیت سے مولوی صاحب ایک بلند مقام کے مستحق ہیں ۔ ان کا کام ہماری نظر سے اوجھل رہا ، یہ ان کا نہیں ہمارا قصور ہے ۔

''پیسہ اخبار'' ''غم خوار عالم'' اور ''اردو اخبار'' کے علاوہ مولوی صاحب نے اس زمانے کے دوسرے اخباروں میں بھی ضرور لکھا ہوگا ۔ اپریل ۱۹۰۱ع میں جب شیخ عبد القادر نے ''مخزن'' جاری کیا تو اس کے پہلے ہی شمارے میں مولوی احمد دین کا ایک مضمون ''مطالعۂ الفاظ'' شامل کیا ۔ مضمون کے ساتھ شیخ صاحب نے یہ نوٹ لکھا :

''ذیل میں ہم ایک تمہیدی مضمون ''مطالعۂ الفاظ'' پر درج کرتے ہیں ۔ اس کے لکھنے والے ہمارے مکرم دوست مولوی احمد دین صاحب بی ۔ اے وکیل ، مصنف ''اورنگ زیب'' ہیں ۔ مولوی احمد دین صاحب اپنے زمانۂ تعلیم میں نامور طلبہ رہے ہیں اور فراغت تحصیل کے بعد لاہور کے نامی وکلاء میں ہیں ۔ اس سلسلۂ مضامین کی تکمیل پر یقیناً سب ناظرین کی رائے ہوگی کہ یہ اردو میں ایک

مفید اور نئی چیز ہے ۔''[1]

اس اقتباس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ۱۹۰۱ء تک مولوی صاحب کو مصنف کی حیثیت سے اچھی خاصی شہرت حاصل ہو چکی تھی ۔ اس مضمون کی دوسری قسط ستمبر ۱۹۰۱ء کے مخزن میں شائع ہوئی تھی ۔ یہ مضمون دراصل مولوی صاحب کی بلند پایہ تصنیف ''سرگزشت الفاظ'' کا ابتدائی نقش ہے ۔ ''مخزن'' میں مولوی صاحب کے دو اور مضامین بھی ملتے ہیں : (۱) ''لاہور کا محرم'' شمارہ ماہ اگست ۱۹۰۱ء[2] (۲) ''مجاز و حقیقت'' شمارہ بابت ماہ اپریل ۱۹۰۲ء[3] اول الذکر مضمون میں لاہور کے محرم کی تصویر کشی کی گئی ہے اور دوسرے مضمون میں نہایت شاعرانہ انداز میں مجاز و حقیقت کے مسئلے پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے :

''حسن بتاں موسیقی کے دل کش نغموں کی طرح ظاہر کے تاروں سے باطن کے پردے ہلاتا ہے ۔ اس کی اداؤں میں بھی وہی جادو کے انداز ہیں ۔ اگر کوئی گا رہا ہو تو کان لگاؤ ۔ دیکھو تو کس جادو کے انداز سے مست ترانوں کی ہوش ربا سریلی آواز ہمارے دل کی ناسپردہ پیچ در پیچ راہوں میں سے ہوتی ہوئی اپنی اٹکھیلیوں سے اس کے نازک سے نازک پردوں کو چھیڑتی جاتی ہے اور اپنی اس سحر اثر چال سے ہماری موجودہ اورگزشتہ زندگی کے تاروں میں ایک خاموش حرکتِ یگانگت پیدا کر رہی ہے ۔ اس کے تھوڑے سے چھیڑنے سے آن کی آن میں ہماری عمر بھر کی سوز و الفت کی چنگاریاں جو محنت و کلفت کے سالوں میں بکھری پڑی تھیں ہمارا دل گداز کیے دیتی تھیں ۔''

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے مولوی صاحب کا کئی اخبارات سے تعلق رہا ۔ ظاہر ہے کہ انھوں نے ان اخباروں میں بہت سے مضامین لکھے ہوں گے ۔ مگر ان مضامین کی نشاندھی ممکن نہیں ۔ جو چار مضامین دریافت کیے جا سکے ہیں ان میں ''راز و نیاز'' ایک بلند پایہ ادبی تخلیق ہے ۔ اسے اردو کے بہترین انشائیوں میں شمار کیا جا سکتا ہے ۔ یہ مضمون مولوی صاحب نے جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے ، انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں پڑھنے کے لیے لکھا تھا لیکن بوجوہ اسے مکمل طور پر اجلاس میں پڑھا نہ جا سکا اور بعد میں ۱۹۰۴ء کی سالانہ

۱۔ ''مخزن'' لاہور ، جلد ۱ ، شمارہ ۱ ، بابت اپریل ۱۹۰۱ء ، ۸
۲۔ یہ مضمون راقم الحروف نے روزنامہ ''جنگ'' کراچی کے محرم نمبر ۳ مئی ۱۹۶۶ء میں بھی شائع کرا دیا تھا ۔
۳۔ دوسری بار یہ مضمون ''قومی زبان'' بابت ستمبر ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا ۔

روداد میں شائع ہوا[1] اس انشا میں مصنف نے تمثیلی اندازمیں ایک بہت بڑے قومی مسئلے کو پیش کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ مسلمان جب تک ایسے لوگوں کے اثر سے آزاد نہ ہوں گے جو مذہب کی آڑ میں ذاتی فوائد حاصل کرتے ہیں ، اس وقت تک قومی ترقی کا سوال پیدا نہیں ہوتا ۔ انجمن ''حمایت الاسلام'' کو عاشق قرار دیا ہے ، قوم کو معشوق اور خود غرض مذہب فروشوں کو رقیب بنا کر پیش کیا ہے ۔ عاشق ، معشوق سے شکوے گلے کرتا ہے اور رقیب کی بد اعمالیوں کی داستان بیان کرتا ہے ۔ مضمون کا تمثیلی انداز قاری کو اصل معاملے کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتا ہے ۔ یہ فن مولوی احمد دین نے اپنے استاد محمد حسین آزاد سے سیکھا ہے اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ شاگرد اگر استاد سے آگے نہیں بڑھا تو اس سے پیچھے بھی نہیں رہا ۔ اس انشائیے میں اس زمانے کے ہندوستانی مسلمانوں کی حالت کی کامیاب عکاسی کی گئی ہے ۔ سرسید ، ان کی تحریک اور ان کے مخالفوں کی سرگرمیوں کو چند سطروں میں اس طرح بیان کیا ہے کہ تمام حالات کا ایک ایک پہلو نظروں کے سامنے آ جاتا ہے ، لکھتے ہیں :

''آپ کی ان رسوائیوں اور ذلتوں کے درمیان آپ کے باغ کے مالی کی ، وہی مالی جس نے تیرہ سو سال ہوئے کہ قسم قسم کے پھل بوٹے ، دور دور سے اکٹھے کرکے خوبصورت چمنوں میں سجا دیے تھے ، یادگار ایک بڈھے جوان مرد نے آپ کی اس حالت کو دیکھا ۔ اپنے نانا کے ہاتھ کے لگائے ہوئے پودوں کو سوکھ کر کانٹا ہوتے دیکھ کر ایک آگ سی دل میں لگ گئی اور اس نے کوشش کی کہ وہی آگ کچھ اور دلوں میں بھی ،جہاں کہیں ہوں ، لگا کر ایک تماشا دیکھے اور دکھائے کہ آگ سے گل راز کیسے کھلتا ہے :

جلا سکتی ہے شمع کشتہ کو موج نفس ان کی
الٰہی کیا چھپا ہوتا ہے اہل دل کے سینوں میں

بڈھے کی اس آگ سے ایک بھبھوکا اٹھا اور اٹھتے ہی چاروں طرف سے اس پر پانی ڈالنے کی کوشش کی گئی لیکن ان دنوں میں ہوا بھی کچھ ایسی چل رہی تھی کہ اس آگ کی چنگاریاں ادھر ادھر پھیل گئیں اور اس سے باغ میں عجب ہل چل سی مچ گئی ۔ ایک طرف تو وہ چنگاریاں ایسی خشک ٹہنیوں اور پتوں میں جا پڑیں کہ یک لخت آگ بھڑک اٹھی اور اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جوکچھ سامنے آیا بڈھے کی خواہشوں کے برخلاف جلا کر راکھ کر ڈالا ۔ دوسری طرف آگ بجھانے والوں نے بے سوچے سمجھے اس قدر پانی ڈالا کہ آگ تو بجھ گئی مگر

۱۔ دوسری مرتبہ یہ مضمون ''قومی زبان'' کراچی بابت ماہ اپریل ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا ۔

پانی پودوں اور بڑے بڑے درختوں کو بھی بہا کر لے گیا ۔ درخت اگرچہ باغ کی چار دیواری کے اندر ہی رہے مگر دیکھا تو بے سرو سامانی کی حالت میں پڑے ہاتھ پاؤں پھیلائے ہوئے چھوٹے پودوں اور گھاس کو پھولنے اور پھلنے اور سر اٹھانے سے روک رہے ہیں . . . ۔

باغ کی دیوار پر ایک بلبل جو اسی باغ کی ہوا خواہ تھی اور یہیں کی تربیت یافتہ ، باغ کے اس ویرانے پر آنسو بہا رہی تھی اور اپنے نالوں سے دلوں کو ہلا رہی تھی زار زار روتی تھی اور کہتی تھی :

قدیم وضع پہ قائم رہوں اگر اکبر
تو صاف کہتے ہیں سید یہ رنگ ہے میلا
جدید طرز اگر اختیار کرتا ہوں
خود اپنی قوم مچاتی ہے شور و وا ویلا

مولوی احمد دین کا صرف یہی ایک مضمون انہیں اردو زبان کا ایک صاحب طرز انشاء پرداز منوانے کے لیے کافی ہے ۔

تصانیف : مولوی صاحب کی تصانیف و تراجم کے بارے میں قطعی طور پر کچھ بتانا ممکن نہیں ہے ۔ منشی محمد الدین فوق نے ان کی صرف تین کتابوں ''عالم گیر'' ، ''اقبال'' اور ''سرگزشت الفاظ'' کے نام گنوائے ہیں[1] ۔ مولوی محمد اسماعیل پانی پتی نے بھی ''نقوش'' کے لاہور نمبر میں اسی بیان کو دہرایا ہے[2] ۔ ان حضرات کے علاوہ کسی اور نے مولوی صاحب کی تصانیف کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ۔ راقم الحروف نے اُن کی گیارہ تصانیف اور دو تراجم کا سراغ لگایا ہے ۔ اگر مزید چھان بین کی جائے تو اور بھی تصانیف کی نشاندہی کی جا سکتی ہے ۔

مولوی صاحب نے زیادہ‌تر تاریخی موضوعات پر لکھا ہے ۔ تیرہ کتابوں میں سے دو ادبی و لسانی موضوعات پر ہیں ۔ ایک کا موضوع معلوم نہ ہو سکا اور باقی دس تاریخی موضوعات پر ہیں ۔ ان تصانیف و تراجم کے نام یہ ہیں :

(۱) ابو المظفر محی الدین اورنگ زیب (۲) افواج دنیا (ترجمہ) (۳) اسرار حرم (ترجمہ) (۴) حیات ٹوڈرمل (۵) جلال الدین اکبر (۶) در مکتوم (حیات زیب النساء) (۷) مہاتما بدھ (۸) شیر پنجاب مہاراجہ رنجیت سنگھ (۹) لیلوا یا محاصرہ غرناطہ (۱۰) ابوالفضل کی سوانح عمری (۱۱) سوانح عمری حاتم طائی (۱۲) سرگزشت الفاظ (۱۳) اقبال ۔

۱۔ ''تاریخ اقوام کشمیر'' دوسرا ایڈیشن ، ۱۹۳۴ء ، صفحات ۵۴۲-۵۴۳ ۔
۲۔ ''نقوش'' لاہور نمبر ، صفحہ ۹۱۵ ۔

چار مزید کتابیں ایسی ہیں کہ جن کے بارے میں پورے وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ مولوی احمد دین کی تصانیف ہیں یا نہیں ۔ ان میں سے ایک کتاب ''حیات ٹوڈرمل'' کے سرورق ۲ اور ۳ پر دس کتابوں کا اشتہار ہے ۔ کسی کتاب کے ساتھ مصنف کا نام نہیں ہے ، لیکن ان میں سے چھ یقینی طور پر مولوی صاحب کی ہیں جو راقم الحروف کی نظر سے گزر چکی ہیں یا دوسرے ذرائع سے ان کا مولوی احمد دین کی تصنیف ہونا ثابت ہے ۔ باقی چار کتابیں یہ ہیں :

(۱) ملا دو پیازہ (۲) دوست محمد خاں (۳) راجہ بیربر (۴) حیات نور جہاں و جہانگیر ۔

عبداللہ قریشی صاحب نقوش لاہور نمبر صفحہ ۱۰۰۰ کے حوالہ سے حیات ٹوڈر مل ، راجہ بیربر اور حیات نور جہاں و جہانگیر منشی محمد الدین فوق کی تصانیف بتاتے ہیں ۔ صرف ایک کتاب 'دوست محمد خاں' میری نظر سے گزری ہے ۔ اس پر مصنف کے نام کی جگہ ''مولفہ کارپردازان دفتر اردو اخبار لاہور'' لکھا ہے ۔ جہاں تک اس کتاب کے انداز تحریر کا میں نے تجزیہ کیا ہے ، یہ مجھے مولوی صاحب ہی کی تالیف معلوم ہوتی ہے ۔ شاید کسی مصلحت کی بنا پر ان کا نام نہ دیا گیا ہو ۔ کتاب کے سرورق پر مطالب کتاب کا جو خلاصہ دیا گیا ہے ، وہ یہ ہے :

''سلطنت افغانستان کے مختصر حالات ۔ ابدالی خاندانی کے کمزور بادشاہوں کے عہد سلطنت میں اس کی تباہی ، فتح خاں کی ہمت کوشش اور افغانستان کی اصلاح ، اس کا دردناک انجام ، دوست محمد خاں اور کے بھائیوں کی خانہ جنگیاں ، دوست محمد خاں کا امیر کابل ہونا ، انگریزوں کا شاہ شجاع کو تخت نشین کرنا ، دوست محمد خاں کا اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کرنا ۔ اکبر خاں اس کے بیٹے کا انگریزی سپاہ کا صفایا کرنا ، دوست محمد خاں کی واپسی وغیرہ کے دل چسپ اور تاریخی حالات ۔''

یہ کتاب ۹۵ صفحات پر مشتمل ہے اور اسے مطبع 'اردو اخبار' کی طرف سے شائع کیا گیا تھا ۔

محولہ بالا اشتہار میں بقیہ تین ''مشتبہ'' کتابوں کی جو تفصیل دی گئی ہے ، اسے یہاں نقل کرنا دل چسپی سے خالی نہ ہوگا :

(۱) ملا دو پیازہ : ابوالمظفر ''ملا دو پیازہ'' کے حالات زندگی ایسے مذاق آمیز پیرائے میں بیان کیے گئے ہیں کہ انسان ہنستے ہنستے لوٹن کبوتر بن جائے اور ہاں حالات بھی تو ایسے شخص کے ہیں جو مذاق مجسم تھا ۔

(۲) راجہ بیربر : اکبر کے دربار میں ابوالظرافت ''بیربر'' کی جو عزت ہوتی

تھی اس کا شہرہ ہر ایک نے سنا ہوگا ۔ اگر صحیح حالات معلوم کرنے ہوں تو راجہ بیربر کا مطالعہ فرمائیں ۔

(۳) **حیات نور جہان و جہانگیر :** ہندوستان کی حسین ملکہ ''نور جہان'' اور مشہور حسن پرست بادشاہ شہنشاہ ''جہانگیر'' کے مکمل اور صحیح حالات نہایت معتبر اور چیدہ مورخوں کے اقوال ، غلط بیانی کی تردید ۔

مولوی صاحب کی جو تصانیف دریافت کی جا سکی ہیں ، ان میں سے بیشتر ادارہ ''اردو اخبار'' کی طرف سے شائع ہوئی تھیں ۔ ان میں سے کسی کتاب پر بھی سال تصنیف یا سال طباعت درج نہیں ہے ۔ ذیل میں مولوی صاحب کی تصانیف کا جو جائزہ پیش کیا جا رہا ہے ، اس میں ''پیسہ اخبار'' کے ادارے کی طرف سے شائع شدہ کتابوں کے بعد اردو اخبار کی شائع کردہ کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے ۔ اس کے بعد سن وار ترتیب کو ملحوظ رکھا گیا ہے ۔

ابوالمظفر محی الدین اورنگ زیب : جیسا کہ بیان کیا جا چکا ھے ، اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۰۱ع سے پہلے شائع ہو چکا تھا ۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۰۴ع میں کارخانہ 'پیسہ اخبار' کی طرف سے شائع ہوا اور یہی راقم الحروف کے پیش نظر ہے ۔ یہ ۱۳۶ صفحات کی کتاب ہے جس میں اورنگ زیب کے حالات اور اس کے عہد کے معاشرتی و سیاسی واقعات بیان کیے گئے ہیں ۔ مولوی صاحب نے دیباچے میں تفصیل سے اس کتاب کی وجہ تصنیف بیان کی ہے ۔ انھوں نے بتایا ہے کہ اورنگ زیب پر جو مختلف نوعیت کے الزامات لگائے جاتے ہیں وہ آن مغربی سیاحوں کے بیانات کا نتیجہ ہیں جنھوں نے کچھ عرصے ہندوستان میں قیام کرنے کے بعد بلا تحقیق اپنے خیالات کو تاریخی صداقت بنا کر پیش کیا ۔ مولوی صاحب نے ایسے سیاحوں ، خصوصاً برنیر کے بعض بیانات بطور نمونہ پیش کرکے بتایا ہے کہ یہ سیاح ہندوستان اور یہاں کے باشندوں کو کس حد تک سمجھنے کی صلاحیت رکھتے تھے ۔ ان سیاحوں کے بیانات کو مغربی مورخوں نے بھی بلا چون و چرا تسلیم کر لیا اور اس طرح اورنگ زیب کی ایک ایسی تصویر پیش کی جو اصل سے کوئی مطابقت نہ رکھتی تھی ۔ مولوی صاحب کا خیال ہے کہ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ مغربی مورخین فارسی زبان سے نابلد تھے لہٰذا وہ اصل ماخذ کو پڑھنے اور سمجھنے کی زحمت گوارا نہ کر سکے اور اس بنا پر ان کی تصانیف حقیقت سے دور ہو گئیں ۔ اورنگ زیب سے مغربی مورخین کی نا انصافی کی ایک وجہ انھوں نے یہ بھی بیان کی ہے :

''کسی شہنشاہ ھند کی تاریخ لکھنے کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ اس کا مورخ ھند کے قومی و ملکی حالات سے بخوبی ماہر ہو اور جب تک ان حالات سے کسی

شخص کو پوری واقفیت نہ ہو اس کی کتاب اپنے ہیرو کے کریکٹر کا پورا آئینہ نہیں ہو سکتی ۔ اورنگ زیب کے یورپین مورخین اس امر میں بھی قاصر تھے ۔ انھوں نے اورنگ زیب کا کریکٹر لکھنے کے وقت اپنی قوم اور ملت کی عادات و خیالات کو جو ان کے طبعی ہیں ، مقیاس ٹھہرایا ہے اور اس مقیاس سے اس کا اندازہ کرنے میں وہ سیدھی راہ سے کہیں دور جا پڑتے ہیں ۔''[۱]

مولوی صاحب نے ان مورخین کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو دور کرنے کے خیال سے یہ سوانح عمری لکھی ۔ انھوں نے الزامات کو دور کرنے پر ساری توجہ صرف نہیں کی بلکہ اورنگ زیب کی داستانِ حیات کو اس انداز سے بیان کیا ہے کہ خود بخود ہر الزام کی قلعی کھلتی چلی جاتی ہے ۔ اورنگ زیب پر سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ اس نے راجپوتوں ، مرہٹوں اور دکنیوں کو بلا وجہ نشانۂ ستم بنایا ۔ مولوی صاحب نے ان تمام حالات و واقعات کا مورخانہ بصیرت کے ساتھ تجزیہ کیا ہے جن کی بنا پر اورنگ زیب ان تینوں کے خلاف نبردآزما ہوا ۔ یہ کتاب اورنگ زیب کی ایک غیر جانبدارانہ تصویر پیش کرتی ہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مصنف کی اپنے موضوع سے عقیدت جا بجا نظر آتی ہے لیکن یہ عقیدت اظہار حقیقت میں کہیں رکاوٹ نہیں بنتی ۔

اسی موضوع پر شبلی نعمانی کی کتاب ''اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر'' مولوی احمد دین کی کتاب کی اشاعت کے کئی سال بعد ۱۹۰۸ع میں منظر عام پر آئی ۔ شبلی نے صرف 'اورنگ زیب' پر عائد شدہ الزامات کو رد کیا ہے مکمل سوانح عمری نہیں لکھی لیکن مولوی احمد دین نے 'اورنگ زیب' کی پوری زندگی کی تصویر کشی کی ہے اور اسی ضمن میں متعصب مورخین کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو دور کیا ہے ۔ اس اعتبار سے دونوں کتابوں کا موضوع بڑی حد تک ایک ہی ہے اور ان میں خاصی مماثلت پائی جاتی ہے ۔ یہاں تک کہ بعض الزامات کی تردید میں دونوں نے یکساں انداز اختیار کیا ہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تحقیقی اعتبار سے شبلی کا پلہ بھاری ہے لیکن یہ خیال کرنا بے جا نہ ہوگا کہ شبلی نے جب اپنی کتاب لکھی ہوگی تو احمد دین کی تصنیف (جو اردو میں 'اورنگ زیب' کی پہلی مکمل سوانح عمری ہے) ضرور ان کے پیش نظر رہی ہوگی اور ویسے بھی جن دنوں میں یہ کتاب شائع ہوئی تھی ، اس زمانے میں شبلی لاہور ہی میں مقیم تھے ۔

مولوی احمد دین کی کتاب کو اپنے زمانے میں خاصی شہرت ملی مگر

۱۔ دیباچہ ''اورنگ زیب عالمگیر'' مصنفہ احمد دین ، ۳ ۔

شبلی کی کتاب کی اشاعت کے بعد اس کی اہمیت کم ہو گئی اور رفتہ رفتہ یہ نقش و نگار طاق نسیان بن گئی ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ گزشتہ نصف صدی میں 'اورنگ زیب' پر بہت کام ہوا ہے لیکن آج بھی اس کتاب کا مطالعہ فائدے سے خالی نہیں ۔ مولوی صاحب کی کتاب نے اورنگ زیب کی شخصیت کو سمجھنے میں جو کارنامہ انجام دیا ہے ، اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔

افواج دنیا : یہ ۲۹۶ صفحات کی ایک کتاب ہے جو انگریزی کی کسی تصنیف کا ترجمہ ہے ۔ یہ ۱۹۰۱ع میں مطبع خادم التعلیم پنجاب لاہور کی طرف سے شائع ہوئی تھی ۔ اس کا موضوع دنیا کے مختلف ممالک (مثلاً آسٹریا ، بلجیم ، برازیل ، بلگیریا ، چلی ، چین ، ڈنمارک ، مصر ، انگلستان وغیرہ) کی افواج سے متعلق ہے ۔ ہر ملک کی فوج کی خصوصیات تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہیں ۔ ابتداً ایک فرہنگ اصطلاحات ہے جس میں تقریباً چالیس انگریزی اصطلاحات کی تشریح مترجم کی طرف سے دی گئی ہے ۔ ترجمہ رواں دواں اور شگفتہ زبان میں ہے ۔

اسرار حرم : یہ رینالڈس کے ناول ''دی لوز آف دی حرم'' کا اردو ترجمہ ہے جسے حکیم رام کشن جنرل بک مرچنٹ ، کٹڑہ تارکشاں ، لوہاری گیٹ لاہور نے شائع کیا تھا ۔ یہ ترجمہ ۲۱۱ صفحات پر مشتمل ہے ۔ مولوی صاحب نے لفظی ترجمہ نہیں کیا بلکہ اصل کے مطالب کو اختصار اور خالص تخلیقی انداز میں پیش کیا ہے ۔ ابتدا میں ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۳ع کی لکھی ہوئی ، مولوی صاحب کی مختصر سی یہ تمہید بھی ہے :

''ناظرین ! آپ کی تفریح طبع کے لیے انگلستان کے جادو نگار ناولسٹ رینالڈس کے ایک نہایت عمدہ ناول ''دی لوز آف دی حرم'' کو اردو قالب میں پیش کیا جاتا ہے ۔ اس خیال سے کہ آپ کی طبیعت پر اس کا مطالعہ شاق نہ گزرے ، ہم نے اختصار اور دلچسپی کو مد نظر رکھا ہے اور آپ کو روزمرہ کی دلکش اردو زبان میں اس کا ویسا ہی مزہ آئے گا جیسا کہ رینالڈس کی اصلی زبان پڑھنے سے حاصل ہوتا ہے ۔ اس مختصر سی تمہید کے بعد آپ بخوشی ''اسرار حرم'' کے مطالعہ میں مشغول ہوں ۔''

حیات ٹوڈرمل : اس میں شہنشاہ اکبر کے وزیر راجہ 'ٹوڈرمل' کے حالات زندگی دیے گئے ہیں ۔ ۲۵ صفحات کی اس مختصر سی کتاب میں 'ٹوڈرمل' کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے ۔ اس کی فوجی اور انتظامی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ اس کی ذہانت اور علمی دلچسپیوں کی روداد بھی پیش کی گئی ہے ۔ اس کتاب میں مولوی احمد دین نے اپنے استاد مولانا محمد حسین آزاد کی تصنیف ''دربار اکبری'' سے خاصا استفادہ کیا ہے بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا

کہ یہ کتاب در اصل ''دربار اکبری'' ہی کے فیضان کا نتیجہ ہے ۔ اسے منشی رام اگروال تاجر کتب ، مہتمم کتب خانہ تعلیم پنجاب و پروپرائٹر اردو اخبار انار کلی لاہور نے فیض عام پریس ، لاہور سے طبع کرا کے شائع کیا تھا ۔

جلال‌الدین محمد اکبر : راقم‌الحروف کے سامنے کتاب کے دو ایڈیشن ہیں ، لیکن دونوں پر تاریخ طباعت درج نہیں نیز یہ صراحت بھی نہیں ملتی کہ پہلا ایڈیشن کون سا ہے اور دوسرا کون سا ۔ دونوں مرتبہ یہ کتاب منشی رام اگروال تاجر کتب ہی نے شائع کی ۔ دونوں ایڈیشنوں میں کوئی فرق نہیں ، سوائے اس کے کہ ایک ایڈیشن کے صفحات ۱۳۵ ہیں اور دوسرے کے ۱۳۶ ۔ اس کتاب کے مختصر سے دیباچے میں موضوع اور مآخذ پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی گئی ہے :

''موجودہ سوانح عمری میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ اس مشہور و معروف بادشاہ کے کارناموں ، ایجادوں ، انتظام ، فتوحات وغیرہ کو اختصار سے قلم‌بند کیا جائے ۔ اس مختصر سی لائف کے مطالع سے ناظرین پر خود واضح ہو جائے گا کہ خاکسار مولف کو اس کوشش میں کہاں تک کامیابی ہوئی ہے ۔ وہ اس کی مدح سرائی میں ایک حرف بھی لکھنا نہیں چاہتا اور ''مشک آن است کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید'' کے مقولہ پر عمل کر کے ہمایوں کے سعادت‌مند بیٹے اور بابر کے نامور پوتے کے حالات پبلک کے سامنے پیش کرتا ہے ۔ اصحاب بینش اور اہل دانش سے قدردانی کی امید ہے ۔ اس لائف میں مندرجہ ذیل تاریخوں سے مدد لی گئی ہے ۔ مولف نے اپنی طرف سے کوئی خیالی یا بے سر و پا امر ایزار نہیں کیا ۔ جو کچھ لکھا ہے معولہ تاریخوں کی سند پر لکھا ہے خواہ ان تاریخوں کا نام ہر ایک مقام پر نہ بھی دیا گیا ہو ۔

دربار اکبری مولفہ مولوی محمد حسین صاحب آزاد ۔ سابق پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور ۔ جے ٹالبائے وھیلر کی تاریخ ہند تاریخ ہند مولفہ لیتھبرج (اردو) ۔ سر ایڈورڈ سایوان بارٹ کی تاریخ موسومہ ہندوستان کے فاتح ، جنگجو اور مدبر ۔ فریڈرک اگسٹس لونٹ نوئر کی تاریخ انگریزی ''شہنشاہ اکبر'' ۔

مولف کو اس بات کا افسوس ہے کہ بعض دل چسپ باتیں جو طویل تاریخوں میں دی گئی ہیں اس سوانح عمری میں اختصار کو مد نظر رکھ کر قلم انداز کرنی پڑی ہیں ۔''

لیلےٰ یا معاصرہ غرناطہ : یہ کتاب راقم الحروف کی نظر سے نہیں گزری ۔ اس کی اطلاع ''حیات ٹوڈرمل'' کے سرورق سے ملتی ہے جہاں مصنف کے نام کے ساتھ اس کی چند تصانیف کے نام بھی درج کیے گئے ہیں ۔ بظاہر یہ کتاب کوئی تاریخی ناول معلوم ہوتی ہے ۔ ممکن ہے ''اسرار حرم'' کی طرح یہ بھی کسی کتاب کا ترجمہ ہو ۔

ذیل کی تین کتابیں بھی میری نظر سے نہیں گزریں ۔ حیات ٹوڈرمل کے اندرونی سرورق پر ان کا اشتہار ہے ۔ اس اشتہار میں ان کتابوں کی جو تفصیل پیش کی گئی ہے ، وہ یہ ہے :

در مکتوم یعنی حیات زیب النساء : ''شہنشاہ عالم گیر کی پیاری بیٹی زیب النساء کی ابتدائی زندگی ، ذہانت و جودت ، تحصیل علم ، شاعرانہ مذاق ، مشاعروں کی کیفیت ، عشق و محبت کے چرچے ، شادی کی تجویزیں ، بیگم کا شادی سے انکار ، اس کی حاضر جوابیاں ، عاقل خاں صوبہ دار لاہور سے پاک محبت اور اس کا مہلک نتیجہ ، بیگم کی قید ، شاعری اور وفات نہایت ولولہ انگیز بیان میں تحریر کی گئی ہے ۔''

مہاتما بدھ : ''ساکی منی یا گوتم کی سوانح عمری ۔ جس میں کپل وستو کے شہزادہ کی ابتدائی تعلیم دنیا سے نفرت ، غور و فکر ، والدین کے مشورے سے شادی کرنے (کذا) اس کی بیوی کی عفت و عصمت اور اطاعت ، اس کے چار عبرت بخش نظارے دیکھ کر دنیا سے قطع تعلق کرنے (کذا) فقیرانہ ریاضت تلاش حق ، معرفت ، جدید مذہب کی تلقین ، ہزارہا باشندوں کے پیرو ہونے کے حالات اس عمدگی سے حوالہ قلم کیے گئے ہیں کہ ناظرین بے ساختہ تعریف کریں ۔''

شیر پنجاب مہاراجہ رنجیت سنگھ : ''سکھوں کے مذہب کا آغاز ، اس کے بانی گرونانک صاحب اور دیگر گروہوں کے مختصر حالات ۔ سکھوں کی لوٹ مار اس مذہب کا نشو و نما اور سکھوں کی قوم کا رفتہ رفتہ ترقی کرنا ، سکھ سرداروں کا پنجاب و ہندوستان کے اکثر علاقوں پر قابض ہونا ، رنجیت سنگھ کے آباو اجداد اور خود اس کا ان سرداروں کو مطیع کرنا ، اس کی شجاعت و لیاقت ، مہمات ، انتظام ، فوج اور سلطنت کی صحیح صحیح کیفیت ۔''

سوانح عمری حاتم طائی : یہ ۹۱ صفحات کا ایک رسالہ ہے جس میں حاتم کے مختصر حالات اور چھ حکایتیں درج ہیں ۔ ناشر اور سال طباعت کی صراحت سرورق پر ان الفاظ میں کی گئی ہے :

حکیم رام کشن مالک تجارتی کتب خانہ و کارخانہ جڑی بوٹی (پنجاب) نے ۱۹۱۶ع میں ہندوستان اسٹیم پریس لاہور میں بہ اہتمام گوراندتا مل بہار دواجیہ ، پرنٹر و پبلیشر سے چھپی ۔

ابوالفضل کی سوانح عمری : یہ ۳۲ صفحات کی مختصر سی کتاب ہے جس میں ابوالفضل کے حالات زندگی پیش کیے گئے ہیں ۔ اسے پندرہ ذیلی عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے ۔ جن میں ابوالفضل کی پیدائش سے وفات تک کے تمام اہم واقعات

کو اجالا" لکھا گیا ہے ۔ مصنف نے تمام ضروری معلومات اس انداز سے دی ہیں کہ موضوع کی زندگی کا کوئی پہلو نظر انداز نہیں ہوا ۔ ابوالفضل کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس کی خامیوں پر بھی نظر ڈالی ہے اور جہاں ایک طرف اس الزام کی تردید کی ہے کہ وہ محض اکبر کا ایک خوشامدی تھا وہیں دوسری طرف یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ اس نے علماء کی مخالفت کر کے کچھ اچھا نہیں کیا ۔

میرے پیش نظر اس کتاب کا جو نسخہ ہے اس کا سرورق ضائع ہو چکا ہے ۔ آخری صفحے پر چند کتابوں کا اشتہار ہے جس کے نیچے ''فضل الدین تاجر کتب قومی و مہتمم اخبار اشاعت لاہور کشمیری بازار'' درج ہے ۔ ظاہر ہے کہ یہ کتاب اسی ناشر نے شائع کی ہوگی ۔ کتاب کے آخر میں مصنف کا نام ''احمد الدین لاہوریہ لکھا ہے ۔

سرگزشت الفاظ : یہ کتاب مولوی صاحب کی تصانیف ہی میں نہیں اردو ادب میں بھی ممتاز حیثیت رکھتی ہے ۔ یہ اپنے موضوع پر پہلی اور (اب تک آخری بھی) مستقل تصنیف ہے ۔ سب سے پہلے مولوی محمد حسین آزاد نے اس موضوع پر لکھا ، مولوی احمد دین نے اپنے استاد ہی کی پیروی میں اس موضوع کو اپنی کتاب میں تفصیل سے پیش کیا ۔ یہ کتاب مولانا آزاد ہی کے نام منسوب ہے ۔ اس انتساب کے سلسلے میں ''سرگزشت الفاظ'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں :

''مولانا مولوی محمد حسین آزاد کا نام نامی زیب عنوان کیا ہے اور اس لیے کہ مولانا ادبیات اردو میں سلامت زبان ، لطافت بیان اور لفظوں میں جان ڈال کر جیتی جاگتی تصویریں نظروں کے سامنے کھڑی کر دینے میں تا حال بے مثال ہیں ۔ زبان اُردو میں مولانا علم اللسان اور تحقیقات لفظی میں پیش رو ہیں ۔ مولف کو مولانا کی شاگردی کا فخر حاصل ہے اور مولانا کی تصانیف سے کہیں کہیں اقتباسات بھی دیے گئے ہیں ۔''[1]

یہ کتاب ۱۹۲۳ع میں شائع ہوئی تھی ۔ حکومت پنجاب کے محکمہ تعلیم نے اسے ۱۹۲۳ع میں صوبے کی بہترین تصنیف قرار دے کر مصنف کو ساڑے سات سو روپے کا انعام دیا تھا اور ٹکسٹ بک کمیٹی پنجاب نے صوبے کے مدارس کے کتب خانوں کے لیے اس کے سوا تین سو نسخے خریدے تھے ۔[2]

مولوی احمد دین کو تحقیقات لفظی سے ابتدا ہی سے دلچسپی تھی ۔ انہوں

۱۔ ''سرگزشت الفاظ'' مطبع کریمی لاہور ، طبع اول ، م ۔

۲۔ کتاب ''اقبال'' کے آخری سرورق پر ''سرگزشت الفاظ'' کا اشتہار ہے ۔ یہ تمام معلومات اسی اشتہار سے لی گئی ہیں ۔

نے اس کتاب کی داغ بیل ۱۹۰۱ع ہی میں ڈال دی تھی جب کہ ''مطالعۂ الفاظ'' کے عنوان سے ان کا ایک مقالہ دو قسطوں میں ''مخزن''[۱] میں شائع ہوا تھا۔ گویا ۱۹۰۱ع سے ۱۹۲۳ع تک وہ اس موضوع پر غور و فکر کرتے اور مواد جمع کرتے رہے اور اس طرح بائیس برس کی محنت کے بعد ''سرگزشت الفاظ'' وجود میں آئی۔ مولوی صاحب نے دیباچے میں بتایا ہے کہ انھوں نے پادری ٹرنچ کی کتاب ''مطالعۂ الفاظ'' کو اپنے سامنے رکھا :

''اس پیش کش میں ''مطالعۂ الفاظ'' کا طرز بیان ہی قائم رکھنے کی کوشش کی گئی ہے اور جہاں تک ممکن تھا پادری صاحب موصوف کے سلسلۂ تحریر کو ہاتھ سے نہیں دیا۔ البتہ انگریزی ، فرانسیسی ، لاطینی الفاظ کی بجائے اردو ، ہندی ، فارسی اور عربی کے الفاظ منتخب کئے گیے ہیں۔''

راقم الحروف کو ٹرنچ کی کتاب دستیاب نہیں ہو سکی ورنہ دونوں کتابوں کے موازنے سے یہ معلوم ہو سکتا تھا کہ مولوی صاحب نے ٹرنچ سے کہاں تک استفادہ کیا ہے۔ مولوی عبدالحق کا خیال ہے کہ احمد دین نے ٹرنچ کی کتاب کا چربہ اتارا ہے۔ ترتیب بھی وہی ہے اور انداز بیان بھی قریب قریب اسی طرح کا ہے۔[۲]

بہرحال یہ طے ہے کہ مولوی احمد الدین نے ٹرنچ کی کتاب کو بطور نمونہ سامنے رکھا ، البتہ الفاظ کی تحقیق ان کی ذاتی کاوش و محنت کا نتیجہ ہے اور اسی بنا پر اس کتاب کا علمی پایہ بلند ہے اور اسے بے انتہا مقبولیت ہوئی۔

یہ کتاب سات فصلوں پر مشتمل ہے جن میں ایک ہزار سے زائد الفاظ کی اصل سے بحث کی گئی ہے۔ ان میں سے بیش تر الفاظ فارسی الاصل ہیں۔ ابتدا میں مصنف نے یہ بتایا ہے کہ الفاظ کس طرح مختلف اوقات میں اپنے معانی بدلتے رہتے ہیں ، کبھی وہ عروج سے زوال کی طرف آتے ہیں اور کبھی زوال سے عروج کی طرف۔ پہلی دو فصلوں میں زبان اور الفاظ کی حقیقت کے بارے میں تمہیدی باتیں لکھی ہیں اور اسی ضمن میں بعض الفاظ کی اصل بطور مثال بیان کر دی ہے۔ زبان کو متحجر نازک خیالی سے تشبیہ دے کر لکھا ہے کہ اس کے دامن میں بہت سے تاریخی اور اخلاقی حقائق ملتے ہیں جن سے واقف ہونے کے لیے مطالعۂ الفاظ بہت ضروری ہے۔ زبان کے آغاز اور ارتقا پر بھی روشنی ڈالی ہے اور یہ کہا ہے کہ زبان قومی ترقی کے ساتھ ہی ترقی کرتی ہے۔ الفاظ کو

۱۔ ''مخزن'' لاہور ، بابت ماہ اپریل دسمبر ۱۹۰۱ع۔
۲۔ رسالہ ''اردو'' بابت اپریل ۱۹۲۳ع ، ۳۵۵۔

مصنف نے ایسے استعاروں سے تعبیر کیا ہے جو کثرت استعمال کی وجہ سے بادی النظر میں اُس حسن کے حامل نظر نہیں آتے جو ان میں کارفرما ہوتا ہے ۔ اس سلسلے میں انھوں نے ''کہکشاں'' ''تہذیب'' اور ''قوس قزح'' وغیرہ کی مثالیں دی ہے ۔

تیسری فصل میں الفاظ کی اخلاقی حیثیت پر بحث کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ الفاظ اخلاقی اسباق کا خزانہ ہیں ۔ یہ انسان کے اخلاقی انحطاط اور عروج کی داستان سناتے ہیں اور جس طرح انسان عروج و زوال کی منزلیں طے کرتا ہے اسی طرح الفاظ سرگرم سفر نظر آتے ہیں ۔ چوتھی فصل میں الفاظ اور تاریخ کے تعلق کو واضح کیا گیا ہے اور یہ بیان کیا ہے کہ کس طرح لفظی تحقیق ، تاریخی حقائق کو بے نقاب کر سکتی ہے ۔ پانچویں فصل میں ''نئے الفاظ'' پر بحث کی گئی ہے یعنی یہ بتایا گیا ہے کہ بعض اشیا یا شہروں کے نام پہلی بار کس طرح رکھے گئے اور پہلے پہل ان کا استعمال کن وجوہ کی بناء پر ہوا ۔ نئے الفاظ کے وجود میں آنے کے سلسلے میں انھوں نے بتایا ہے کہ مقبول عام تحریکیں نئے الفاظ وجود میں لاتی ہیں اور پھر مولانا آزاد کے حوالے سے (صفحہ ۱۸۷) یہ بھی لکھا ہے کہ بعض دفعہ ممتاز افراد بھی کسی خاص مفہوم کو ادا کرنے کے لیے الفاظ وضع کر لیتے ہیں نیز زمانے کی نئی ضرورتیں بھی الفاظ کی ایجاد میں حصہ لیتی ہیں ۔ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں :

''زمانہ حال کی نئی ضرورتوں نے پچھلے چند سالوں میں ہی زبان میں کئی ایک نئے الفاظ پیدا کر دیے ہیں ۔ سیاسی تحریک کی رو نے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک ایشیائی ممالک کو تہ و بالا کر دیا ہے اور اہم تغیرات سیاسی اور نظامی جو وقوع میں آئے ہیں انھوں نے نئے الفاظ ہر ایک ایسی مملکت کی زبان کو دیے ہیں اور چونکہ ہندوستان کی زبان ان ممالک کی زبانوں سے ایک واسطہ رکھتی ہے یہاں بھی اسی تحریک کی کمزور لہروں نے ان نئے الفاظ میں سے چند ایک ادھر بھی پھینک دیے ہیں جو بخوشی چُن لیے گئے ہیں ۔''[1]

وہ زبان کو بھی انسانوں کی طرح حیات و ممات کے اصولوں کا پابند بتاتے ہیں ۔ ان کی رائے ہے : ''ایسے لوگ بھی گزرے ہیں اور ہیں جو زبان کی حقیقت اور اس کے اصولوں سے محض نا بلد ہونے کی وجہ سے جبراً اس کی ترقی کے مانع ہونے کے درپے ہوئے اور ہو جاتے ہیں ۔ انھیں خیال ہوتا ہے کہ اس کی نشو و نما کافی ہو گئی ہے یا ضروری نہیں اور اب زیادہ ترقی نہ تو درکار ہے اور

۱۔ سرگزشت الفاظ ، ۱۹۱ - ۱۹۲ ۔

نہ ہونی چاہیے لیکن انھیں معلوم نہیں کہ زبان میں بھی زندگی کے ویسے ہی اجزاء ہیں جیسے کہ انسان میں یا درخت میں ۔ انسان کی طرح اس کا نشو و نما مکمل ہوگا ۔ ہاں اگر کوئی بیرونی اسباب زبردستی سے اس کی زندگی کا پیش از وقت خاتمہ کر دیں تو اور بات ہے اور انسان کی طرح ہی اس کی زندگی اصول زوال کے تحت میں بھی ہے ۔ جنگل کے درخت کی طرح جب تک اس میں نشو و نما کی طاقت ہے یہ ہر ایک کمزور رکاوٹ کو جو اس کے پھیلاؤ میں بارج ہوگی ۔ بے اعتنائی کی نظر سے دیکھے گی اور درخت کی طرح ہی پرانے پتے جھاڑے گی اور نئے نئے پتے نکالتی رہے گی ۔ اس طرح کی سب کوششیں زبان کو ایک حد پر محدود کر دینے میں ناکامیاب رہی ہیں ۔ ایسے حالات میں بھی جو کامیابی کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید ہو سکتے تھے زبان کے نشو و نما کی آب یاری عوام کے منہ میں ہے ۔ فیشن کا خاص لوگوں سے عوام میں آنا تو درست لیکن الفاظ ، وہ الفاظ جو زبان کے خزانے میں حقیقی ایزاری دولت کا باعث ہیں عوام سے خواص میں جاتے اور پھیلتے ہیں اور ان میں اکثر ، کوئی کوتاہ اندیش ادیب ان کی خواہ کتنی ہی مخالفت کرے یا انھیں جب تک چاہے نظر انداز کرے زبان میں اپنی جگہ باصرار لیں گے اور اس پر قائم رہیں گے اور وہاں سے انھیں نکالنا یا ہٹانا ناممکن ہے ۔ دنیا کے ادیب ، علما و فضلا بے شک اپنا زور لگا کر دیکھ لیں دنیا برابر آگے کو جا رہی ہے اور زبان کو بھی اس کے ساتھ ساتھ جانے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ۔''[1]

چھٹی فصل میں مترادف الفاظ سے بحث کی گئی ہے ۔ انھوں نے تفصیل سے ان امور کی نشان دہی کی ہے جو مترادف الفاظ کو وجود میں لانے کے ذمہ دار ہیں ۔ مترادف الفاظ میں جو معانی کا نازک فرق ہوتا ہے اس کی وضاحت بھی کی ہے نیز ان الفاظ سے حاصل ہونے والے اخلاق فائدے بھی گنوائے ہیں ۔ اس بحث میں انھوں نے بہت دلچسپ پیرایہ بیان اختیار کیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

''بعض اوقات مترادف الفاظ کا استعمال اخلاقی فائدے سے خالی نہیں ہوتا ۔ جو کچھ ہمارے دل میں ہوتا ہے وہی ہم زبان سے نکالتے ہیں اور اس طرح ان مترادف الفاظ کی مدد سے ہم اپنے اظہار خیالات میں منافقت کے گناہ سے بچ جاتے ہیں ۔ کسی امر کی تائید کرتے ہوئے ضروری نہیں کہ ہم دل سے اس کی راستی کے قائل ہوں اور نہ ہی ہم تائید میں کوئی ایسا خیال ظاہر کرتے ہیں لیکن اگر ہم کسی امر کی تصدیق کر رہے ہوں گے تو ہم صاف صاف بتا رہے ہوں گے کہ ہم خود دل سے اس کے قائل ہیں اور دل سے موید ۔''[2]

۱- سرگزشت الفاظ ، ۲۰۶ - ۲۰۷ - ۲- ایضاً ، ۲۴۸ -

آخری فصل میں ''مدرس اور الفاظ'' کے عنوان سے بتایا ہے کہ تعلیمی ترقی کے لیے زبان کو اچھی طرح جاننا ضروری ہے۔ الفاظ کے ذریعہ طالب علم بہت کچھ سیکھ سکتا ہے لیکن اس سلسلے میں بے احتیاطی نہایت مضر ثابت ہو سکتی ہے۔ فاضل مصنف ''بے تکی تحقیقات'' سے پرہیز کا مشورہ دیتے ہوئے الفاظ سے ''غفلت شعاری'' کو ''نا قابل در گذر گناہ'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ الفاظ کی ظاہری صورت بھی بعض اوقات دھوکہ دیتی ہے۔ اس سلسلے میں وہ رقم طراز ہیں :

''تحقیقات کی کامیابی کے لیے ظاہریت اور دھوکا دینے والی شکل و صورت سے پرہیز کرنا لازمی ہے۔ ظاہری صورت کو بالائے طاق رکھ کر اصل چیز تک پہنچنا اور اسے قابو میں لانا ضروری ہے۔ الفاظ کا بہروپ رنگ کا ہے اور اس کی ماہیت معلوم کرنے کے لیے مستحکم ارادہ اور استقلال طبیعت درکار ہے۔ محنت اور تکلیف سے ہی الفاظ سے حسب منشا اور سچا جواب مل سکتا ہے ورنہ نہیں۔ پوچھنے والا ادھر اُدھر کے جوابات سے نہیں ٹلے گا۔ انھیں چھوڑنے کا نہیں۔ مضبوط ہاتھ سے پکڑے رکھنے پر مصر ہوگا تاوقتیکہ اصل روپ میں نمودار نہ ہوں اور سوالات کا سیدھا جواب نہ دیں۔''[1]

اسی ضمن میں الفاظ کے ہجوں کو اصوات کے مطابق لکھنے کی تجویز کی وہ مخالفت کرتے ہیں اور اس کے نقصانات گنواتے ہیں۔ مختلف الفاظ کے باہمی تعلق اور ایک ہی لفظ کے مختلف معانی میں رابطے کی بحثیں بھی اسی فصل میں آ گئی ہیں۔ مطالعہ الفاظ میں وطن پرستی اور قوم پرستی کے پہلو پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے آخر میں الفاظ اور مذہبی تعلیم پر بحث کی گئی ہے۔

مذکورہ سطور میں پوری کتاب کا ایک دھندلا سا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ایک ناول کی طرح دلچسپ ہے اور یہ دلچسپی خالص علمی و فنی معاملات پر بحث کرتے ہوئے بھی قائم رہتی ہے۔ مصنف کا انداز تحریر نہایت شگفتہ ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی گفتگو کر رہا ہو۔ ایک مثال ملاحظہ ہو :

''پچھلی فصل میں ہم نے بیان کیا تھا۔ نہیں نہیں ہم ایک ایسی عمدہ بات کے موجد ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے، ہم نے ایک بزرگ کا مقولہ نقل کیا تھا کہ زبان نازک خیالی متحجر ہے۔ یہ سچ ہے کہ نازک خیالی کا جادو جو الفاظ میں بھرا پڑا ہے۔ ہم پر کچھ اثر نہیں کرتا اور اگر کبھی کوئی اثر ہوتا بھی ہے تو بہت کم۔ مدت کی واقفیت اور قدرے کم توجہی نے ہمیں الفاظ کی خوبیاں محسوس کرنے اور ان سے لطف اٹھانے سے محروم کر دیا ہے۔ کبھی کسی نے یہ خوبیاں ہمیں جتلانے کی پروا نہیں کی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا اور اس کے سوا اور ہونا بھی

۱- سرگزشت الفاظ، ۲۷۴ - ۵ -

احمد دین نے اقبال کی مشکل گوئی اور سادہ بیانی کے سلسلے میں بتایا ہے کہ ''شکوہ'' اور ''جواب شکوہ'' اس لیے آسان زبان میں ہیں کہ ان کا تعلق عام مسلمانوں کے جذبات سے ہے ۔ ''شمع و شاعر'' کا تعلق عام مسلمانوں سے نہیں ، ان مسلمانوں سے ہے جو قوم کی رہنمائی کرتے ہیں ۔ اس لیے اس کا اسلوب بدلا ہوا ہے ۔ اس کے بعد کلام اقبال میں ''شوکت بیان'' ، ''سوز و گداز'' ، ''تشبیہات و استعارات'' ، ''جوش'' ، ''طرفگی بیان'' اور ''موسیقیت'' کے عناصر کی نشان دہی کی گئی ہے ۔ ''امید'' کا عنوان قائم کر کے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اقبال کسی عالم میں مایوس نہیں ہوتے ۔ ان کے کلام میں ''نا امیدی کی سریں اور آہ و بکا کم یاب ہے اس کے نالے بھی نئے انداز کے ہوتے ہیں ۔ اسے شام غم بھی صبح امید کی خبر دیتی ہے اور ظلمت شب میں اسے امید کی کرن نظر آتی ہے ۔''[1]

طرز بیان کے سلسلے میں احمد دین نے سب سے اہم بحث اس موضوع پر کی ہے کہ اقبال مناظر قدرت اور مادی دنیا سے اخلاقیات ، معاشرت اور سیاسیات کے زرین اصول اخذ کرتا ہے اور مسائل فلسفہ کے ایسے نکات کا استدلال کرتا ہے ، جن سے عقل حیران رہ جاتی ہے ، مضمون آفرینیاں دلفریب اور حیرت‌انگیز ہیں[2] ۔ اس موضوع پر احمد دین نے جو کچھ لکھا ہے ، وہ ان کی نقادانہ بصیرت کی ایک نہایت عمدہ مثال ہے ۔ کلام اقبال کے اس پہلو پر آج تک کسی نقاد نے اس انداز سے روشنی نہیں ڈالی ۔ احمد دین نے تفصیل سے بتایا ہے کہ اقبال جب بھی کسی قومی و ملکی مسئلے پر یا انسانی زندگی کے کسی پہلو پر اظہار رائے کرتے ہیں اور انسانی فطرت کی پیچ در پیچ گتھیوں کو سلجھاتے ہیں تو خود فطرت ہی ان کے لیے ایسی مثالیں مہیا کر دیتی ہے جن سے ان کے شاعرانہ مطالب کو سمجھنے میں بڑی آسانی پیدا ہو جاتی ہے ۔ دریا ، قطرہ ، درخت کی سوکھی ٹہنی ، شبنم ، گوہر وغیرہ کے استعارے ، قومی اتحاد اور انسانی نفسیات کے بیان میں بڑی وضاحت پیدا کر دیتے ہیں ۔ اس طرح ''پھول'' کا استعارہ بھی ''چشم بینا اور گوش شنوا کے لیے اسباق کا ایک دفتر کھولے ہوئے ہے'' ۔ اقبال کو حیات انسانی کے مختلف مراحل میں جو کیفیات نظر آتی ہیں ان کے اظہار کے لیے بھی خصوصیات گل یعنی خود فروشی ، خود نمائی اور خود فراموشی وغیرہ کا سہارہ لیا جاتا ہے ۔ اسی طرح گل و گلزار کے تمام متعلقات شعر اقبال میں بہاراں کا سماں پیدا کر دیتے ہیں ۔ علو ہمتی کے بیان کے لیے بھی اقبال نے جو مثالیں دانہ ، خاک ، روئیدگی ، بالیدگی پیش کی ہیں وہ بھی آغوش فطرت ہی سے مستعار لی ہیں ۔ خودداری کے لیے بھی اقبال حباب ہی کی مثال پیش کرتے

۱- اقبال ، ۲۴۲ ۔ ۲- ایضاً ، ۲۴۴ ۔

یہ لفظ گلاب کا معرب ہے ۔ کراہت سے بچنے کے لیے مسہل کے لیے استعمال ہونے لگا ہے ۔ ''رضائی محمد رضا موجد کے نام پر ہے ۔'' جہاں تک ہمارا خیال ہے یہ لفظ دراصل ''رزائی'' ہے ۔ چونکہ یہ عموماً رنگے ہوئے کپڑے کی بنائی جاتی ہے اس لیے یہ نام پڑ گیا ۔

''پاکھنڈ'' کے لغوی معنی مولف نے ''وید'' کے برخلاف ''بدعت'' بیان کیے ہیں اور اصطلاحی معنی ''وہ عبادت جو دکھاوے کی ہو حرامزدگی ، بدذاتی ، شرارت لیکن لفظ کی تحقیق سے گریز کیا ہے ۔ ''پاکھنڈ'' مرکب ہے ''پا'' اور ''کھنڈ'' سے ''پا'' کے معنی ''پالنے والے یا حفاظت کرنے والے'' کے ہیں ۔ جس سے مراد ''دھرم'' لی جاتی ہے ''کھنڈ'' کے معنی ''منتشر کرنے اور توڑنے'' کے ہیں ۔

بعض الفاظ پردہ پوش ہوتے ہیں یعنی کسی مکروہ یا ناگوار شے یا خیال کو اچھے اور خوشنما الفاظ میں ادا کرتے ہیں ۔ مولف نے ''متوالا'' کے لفظ کو بھی انھیں میں شمار کیا ہے ۔ وہ اسے ''مت'' (سمجھ ، عقل) اور ''والا'' سے مرکب سمجھتے ہیں ۔ حالانکہ یہ لفظ ''مد'' اور ''والا'' سے مرکب ہے ۔ ''مد'' کے معنی ہندی اور سنسکرت میں ''عرق'' ، ''شراب'' اور ''مستی'' کے ہیں ۔ کثرت استعمال سے د ، ت سے بدل گئی ہے ، ان دو حرفوں کا بدل باہم ہوتا ہے ۔ ''اسامی'' کے ایک معنی ''امیر'' کے بھی لکھے گئے ہیں ۔ درحقیقت یہ ''امیر'' کے معنوں میں نہیں آتا ۔ بلکہ بعض اوقات ''مالدار'' سے مراد ہوتی ہے مگر اس میں ہمیشہ ذم کا پہلو ہوتا ہے ۔

مولف نے منجملہ اور بحثوں کے غیر مستقل الفاظ کی طرف بھی توجہ فرمائی ہے جو کتابی خزانوں میں بند اور بے کار پڑے ہیں اور جن سے ہم ناواقفیت یا کم فہمی کی وجہ سے کام نہیں لیتے ہیں ۔ ہمیں اس خیال سے بالکل اتفاق ہے ۔ درحقیقت ایسے الفاظ اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں جن کا استعمال اب نہیں رہا یا جو ٹکسالی نہیں سمجھے جاتے ۔ حالانکہ وہ بعض خیالات کے ادا کرنے میں بہت کام آ سکتے ہیں - افسوس ہے کہ قابل مولف نے اس بحث کو مختصر طور پر چند سطروں میں بیان کر دیا ہے ۔ یہ چنداں قابل شکایت نہیں کیونکہ اس مختصر کتاب میں ہر بحث تفصیل سے بیان نہیں ہو سکتی تھی لیکن شکایت اس کی ہے کہ انھوں نے مثال کے طور پر ایک لفظ بھی تو ایسا نہیں لکھا کہ ان کی رائے میں رواج دینے کے قابل ہے اگر وہ چند مثالیں بھی لکھ دیتے تو ناظرین کو مولف کے مطلب کے سمجھنے میں بہت آسانی ہوتی ۔[1]

۱۔ تنقیدات عبدالحق ، مرتبہ محمد تراب علی خاں ، باز ، مطبوعہ شمس الاسلام پریس ، چھتہ بازار حیدرآباد دکن (بار اول) ، ۱۹۳۴ع ، ۱۱ - ۱۵ -

اس طویل ''تنقید'' کے بعد بابائے اردو مرحوم نے یہ تسلیم کیا ہے ''الفاظ کی تحقیق میں اکثر غلطی ہو جاتی ہے اور اس سے کتاب کی قدر و قیمت کم نہیں ہو سکتی . . . . لائق مولف کی محنت قابل داد ہے ۔ یہ کتاب طلبہ اور عام شائقین کے لیے بہت کار آمد ہے ۔ اس سے ان کے دلوں میں الفاظ کی تحقیق ، لغوی ، معروف اور اصطلاحی معنوں کے فرق ، حالات زمانہ کے اثر سے معنوں میں تغیر و تبدل اور لفظوں کی اصل دریافت کرنے کا شوق پیدا ہوگا اور یہ ادب کی تحصیل میں بہت کچھ مدد دیتا ہے ۔''[1]

اقبال : مولوی احمد دین کی اس کتاب کے پہلے ایڈیشن کے طبع اور ضائع ہونے کی تفصیل پیش کی جا چکی ہے ۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۲۶ع میں شائع ہوا تھا اور اس وقت وہی پیش نظر ہے ۔

اس کتاب کا پورا نام یوں ہے ''اقبال۔علامہ سر محمد اقبال کی اردو منظومات ان کے مقصد شاعری اور خیالات کے نشو و نما ، مضامین کلام اور طرز بیان پر ایک نظر ۔'' یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے جو بالترتیب ''کلام اقبال'' (صفحات ۱—۱۰۰) ۔ ''مضامین کلام'' (صفحات ۱۰۱—۲۱۵) اور ''طرز بیان'' (صفحات ۲۱۶—۲۸۴) کے عنوانات کے تحت ہیں ۔

پہلے حصے میں یہ بتایا گیا ہے کہ اقبال کی ذہنی نشو و نما کن حالات میں ہوئی اور اس کی شاعری ان حالات کی آئینہ دار کس طرح ہے اور کیوں ہے ؟ اس میں اقبال کی شاعری کے وہی تین دور لیے گئے ہیں جو ''بانگ درا'' میں ملتے ہیں اور پھر ہر دور کی خاص خاص نظموں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے ۔ کتاب کا آغاز ڈرامائی انداز سے ہوتا ہے ۔ مصنف نے بازار حکیماں لاہور کی ادبی محفلوں کی منظر کشی کرتے ہوئے اقبال کا تعارف کرایا ہے اور پھر اقبال کی شاعری کے دور اول کا جائزہ لیتے ہوئے سب سے پہلے اقبال کی تین نظموں ''نالہ یتیم'' ، ''ایک یتیم کا خطاب ہلال عید سے'' اور ''ابر گہر بار یا فریاد امت'' کی تفصیل پیش کی ہے ۔ یہ نظمیں ''بانگ درا'' میں شامل نہیں ہیں ۔ ان کے بارے میں احمد دین لکھتے ہیں :

'' یہ تینوں نظمیں ''بانگ درا'' میں جو علامہ اقبال نے شائع کی ہے موجود نہیں ۔ غالباً بعض اصلاحی وجوہات شاعری اور نظر ثانی کے لیے کم فرصتی کی بنا پر مجموعہ میں انھیں درج نہیں کیا گیا ۔ ان میں خیال کی وہ بلندی اور بندشوں کی وہ مسلسل لطافت اور چستی بھی نہیں جو بعد کی نظموں میں پائی جاتی ہے ، لیکن اس میں کلام نہیں کہ تاریخی اعتبار سے مجموعہ' کلام اقبال میں یہ نظمیں ایک

۱۔ تنقیدات عبدالحق ۔ ۱۵ ۔

خاص اہمیت رکھتی ہیں جو نظر انداز نہیں کی جا سکتی ۔ اقبال کے اس سلسلہ منظومات میں جو اقبال کی شہرت کا باعث ہوئیں ، منظومات جو انھیں حمایت اسلام کے سالانہ اجلاسوں کے لیے لکھی گئیں اور پڑھی گئیں ، یہ تینوں نظمیں ایسی کڑیاں ہیں جو چھوڑی نہیں جا سکتیں ۔ علاوہ ازیں ان نظموں میں شاعری کا میلان طبیعت بھی ، اگرچہ سیدھے سادھے الفاظ اور بندشیں ہیں ، نمایاں ہے رسول عربی کا عشق اور قومی درد ایک ایک شعر میں ساری ہے ۔''[1]

اس کے بعد اقبال کے مختصر حالات زندگی دیے گئے ہیں جن میں تحصیل علم اور پروفیسر آرنلڈ سے ملاقات کا ذکر ہے ۔ اس تعلیم و تربیت کا کیا اثر ہوا ؟ اس سلسلے میں مصنف رقم طراز ہیں :

''خاندان ، مدرسہ اور کالج کی تعلیم و تربیت کا اثر جیسا کہ واقعات مابعد نے ظاہر کیا ، اقبال کے دل میں مذہبی جذبات کا پیدا کرنا اور ابھارنا تھا ۔ جذبات جو اس کے کلام میں مختلف صورتوں میں جاوہ آرا ہوتے رہے ، حسن و عشق ، تصوف کے اصل اصول ہیں ۔ صوفیانہ مذاق کی آب یاری نے حسن و عشق کی ''کشت زار'' میں خوب گل کھلائے اور فلسفہ جو اقبال نے لاہور گورنمنٹ کالج کی عالیشان درسگاہ میں پڑھا تھا مذہب کے سایہ میں گوناں گوں رنگ لایا ۔''[2]

رسالہ ''مخزن'' لاہور اور شیخ عبدالقادر کا ذکر کرتے ہوئے اقبال کی ان نظموں کا جائزہ لیا گیا ہے جو اس رسالے میں شائع ہوئیں ۔ اس سلسلے میں تیرہ نظموں ''ہمالہ'' ۔ خفتگان خاک سے استفسار اور ''پروانہ اور بچہ'' وغیرہ) پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے ۔ ہر نظم کے مختصر تعارف کے بعد وہ اشعار درج کیے ہیں جو ان نظموں کے مرکزی خیالات کے حامل ہیں ۔ ان نظموں کے متعلق احمد دین کا مجموعی تاثر یہ ہے :

''اس گلشن ہستی کے نظارے شاعر کی چشم بینا کے لیے حقائق کا ایک دبستان کھولے ہوئے ہیں اور ان نظر فریب نظاروں میں فلسفی تجسس کی نگاہ حقیقت کے راز اور تصوف کے اسرار دیکھتی ہے اور جادو کی زبان سے بیان کرتی ہے ۔''[3]

اس کے بعد اقبال کی ان پانچ نظموں کا جائزہ لیا گیا ہے جو بچوں کے لیے ہیں ۔ ''پرندے کی فریاد'' کے بارے میں ان کی رائے یہ ہے :

''اس کی خوبی اور لطافت بیان نہیں ہو سکتی ۔ اس میں سوز و گداز دل ہلا دینے والا ہے اور اس کی میٹھی میٹھی درد ناک اور درد انگیز سریں بے تاب کیے

۱۔ اقبال ، از احمد دین مطبوعہ اسلامیہ اسٹیم پریس ، لاہور ، ۱۹۲۶ع ، ۸ ۔
۲۔ ایضاً ، ۱۱ ۔ ۳۔ ایضاً ، ۱۲ ۔

دیتی ہیں ۔ یہ نظم کیا بلحاظ سلامت زبان اور کیا بلحاظ سوز بیان اقبال کی بہترین منظومات میں سے ہے ۔ اس میں ایک خاص اہمیت بھی ہے ۔ آپ دیکھیں گے کہ اس میں کچھ سیاسیات کی جھلک سی ہے ۔ جھلک جو اب سیاسیات کی طرف اقبال کے رجحان خیالات کا پیش خیمہ ہے ۔''[۱]

یہاں تک اقبال کے جس کلام کا ذکر آیا ہے ، وہ ان کے گورنمنٹ کالج میں پروفیسر ہونے سے پہلے کی تخلیق ہے ۔ جب اقبال زندگی کے ایک نئے دور میں داخل ہوئے اس کا اثر ان کی شاعری پر بھی پڑا ۔ طالب علمی کے ماحول سے نکل کر انھیں نئے مشاہدات اور تجربات سے دوچار ہونا پڑا اور اس وجہ سے بقول احمد دین ان کے دل میں عشق رسول ؐ پہلے سے بھی زیادہ ہو گیا ۔ نیز انھیں ''حالات حاضرہ کی روشنی میں ملک و ملت کی سیاسی ہستی کے ڈراؤنے گڑھے دل ہلا دینے والے نظر آئے ۔ ان حالات میں اقبال محبت بھرا دل رکھتے ہوئے سیاسیات سے دیر تک الگ نہیں رہ سکتے تھے ۔''[۲] اس کے بعد ان نظموں کا جائزہ لیا گیا ہے جن میں سیاسی مسائل کی طرف اشارے تھے ۔ اس ضمن میں اقبال کے دور اول کی ان نظموں کی تفصیل پیش کی گئی ہے جن میں قومی و ملی جذبات کارفرما ہیں اور ہندوستان کے باہمی اتحاد کے خواب دیکھے گئے ہیں ۔ احمد دین نے نظموں کی تفصیل پیش کرتے ہوئے تشریح و تفسیر کا انداز اختیار کیا ہے ۔ ''تصویر درد'' کو خاص طور پر سراہا ہے اور اس کے بارے میں یہ رائے قائم کی ہے :

''یہ نظم محض ملکی نقطہ نگاہ سے لکھی گئی تھی ۔ اس میں امتیاز ملت و آئین کو معیوب و مطعون ٹھہرایا ہے ۔ وطن اور وطن پرستی اس کے موضوع اور فرقہ آرائی کو اس میں مذموم قرار دیا گیا ہے ۔ خیالات کی بلند پروازی اور کلام کی فسوں کاری کے لحاظ سے یہ نظم وطن پرست ادبیات ہند میں لاجواب ہے ۔''[۳]

اقبال کی دور اول کی شاعری میں فاضل نقاد کو عشق و عاشقی کے ساتھ ساتھ تصوف و حکمت کے عناصر بھی نظر آتے ہیں :

''. . . . لیکن شاعر کے اپنے جذبات میں ابھی وہ کشش نہیں ، اس کے اپنے دل میں ابھی وہ کیفیت وجدان نہیں جو اسے بزم قدرت کا رازدار کر دے ، جو اسے اسرار ہستی کا محرم بنا لے ، اس کی آنکھ ابھی پابند مجاز ہے ، اس کا دل ابھی گرم نیاز ۔''[۴]

۱۔ اقبال ، ۱۹ ۔
۲۔ ایضاً ، ۲۱ ۔
۳۔ ایضاً ، ۳۰ ۔
۴۔ ایضاً ، ۳۵ ۔

نقاد کو اقبال کے ہاں اس دور کی شاعری میں خیالات کی بلند پروازی اور نزاکت بیان کی ''دلربائی'' بھی نظر نہیں آتی نیز وہ لطافت اور شوکت بھی محسوس نہیں ہوتی ''. . . . جو ولایت سے واپسی کے بعد اقبال کی شیوا بیانیاں ، گوناں گوں ترکیبوں میں دکھا رہی ہیں ۔'' ص ۳۷ ۔ اس دور کی شاعری میں نقاد کو دو باتیں نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہیں : ایک تو ''وطن کے بت کی پوجا کا پرچار اور دوسری نظموں میں کسی خاص تعلیم ، خاص تلقین کی عدم موجودگی'' ۔ اس خیال کی توضیح وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں :

''اس میں کلام نہیں کہ اس دور میں بھی مسلمانوں کے عادات و اخلاق اہل ہند کے مختلف مذاہب کی باہمی ناروادراری پر مواعظ ہیں جو سونے کے حرفوں میں لکھنے کے قابل ہیں ، لیکن شاعر کے دل میں ابھی تک وہ جذبہ پیدا نہیں ہوا اور وہ کیفیت طاری نہیں ہوئی تھی جو بعد میں اسے عجمیت سے متنفر اور حجازیت کا والہ و شیدائی بنائے ہوئے ہے ۔ ابھی تک اس کے سامنے کوئی خاص منتہائے مقصد نہیں ۔ اسے کسی خاص امر سے شغف نہیں ۔ ابھی تک اس کا دل ان تاثرات سے خالی ہے جو چند سال بعد ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے اندر آپ اپنا جہان پیدا کر لیتے ہیں ۔''[1]

ستمبر ۱۹۰۵ء میں اقبال یورپ کے سفر کا عزم کرتے ہیں ۔ یہیں سے ان کی زندگی میں ایک نیا موڑ آتا ہے ۔ وطن پرستی ، ملت پرستی میں بدل جاتی ہے اور یہی کیفیت اقبال کی شاعری کے دوسرے دور کا عنوان ہے ۔ دوسرے دور کی نظموں کا جائزہ لینے کے بعد مولوی احمد دین اس نتیجے پر پہنچتے ہیں :

''دوسرے دور کی نظمیں فرنگستان کی آب و ہوا کی زائیدہ اور پروردہ ہیں ۔ ان میں لطافت اور نزاکت ، دل فریبی کے انداز میں جلوہ گر ہے ۔ خیالات کی پرواز عرش تک کی خبریں لا رہی ہے اور تخیل کی سبک سیری ابتدائے آفرینش کی باتیں بتا رہی ہے ۔ شاعر اب بزم قدرت کا راز دار ہو چلا ہے ، اب اسے عالم بالا کے کیمیا گر کی حرکات و سکنات سے واقفیت حاصل کرنے کا موقع مل گیا ہے اور محبت کا نسخہ اور اس کی تاثیر اس سے مخفی نہیں رہی ۔ اب اسے حسن اور خدائے 'لم یزل' کی گفتگو سننے کا فخر حاصل ہے ۔ صرف یہی نہیں ، اس گفتگو کے چرچے بھی محفل قدرت میں اس نے دیکھے اور سنے ہیں ۔ مظاہر قدرت جو پہلے ہمارے فلسفی شاعر کے استفسارات پر کم توجہ کرتے تھے اب خود اسے حال دل سناتے ہیں اور اس کی ہمدردی کے متمنی نظر آتے ہیں ۔''[2]

تیسرے مرحلے میں اقبال کی شاعری فکر و نظر کی مزید منزلیں طے کرتی ہے

۱- اقبال ، ۳۸ ۔ ۲- ایضاً ، ۶۱ ۔

یا اس میں کچھ اور وسعت پیدا ہوتی ہے ، کچھ اور نئے خیالات راہ پاتے ہیں ۔ اس دور کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے مولوی صاحب لکھتے ہیں :

''ان نظموں میں بتایا گیا ہے کہ مادہ پرستی سے سچی خوشی اور نسل انسان کی حقیقی ترقی ممکن نہیں اور تجربہ سے یہ امر پایۂ ثبوت کو بھی پہنچ چکا ہے کہ بنی آدم کی مسرت اور اس کے ارتقا کا راز روحانی زندگی میں ہی مضمر ہے ۔ دنیا کو ظلمت اور تباہی سے بچانے کے لیے نور توحید سے اقصائے عالم کو منور کرنا ضروری ہے اور اس لیے اسلامیوں کو جو امانت توحید کے حامل ہیں لازم ہے کہ اپنے فرض کی ادائیگی میں نور توحید پھیلانے کے لیے کمربستہ ہو جائیں اور مساوات و اخوت کا سبق جو ان کے پیارے نبی نے انھیں دیا تھا اس پر عمل پیرا ہوں اور قول سے فعل سے اس سبق کی تعلیم عام کریں ۔''[1]

اس سلسلے میں ''ترانۂ ملی'' ، ''شکوہ'' ، ''شمع و شاعر'' ، ''جواب شکوہ'' ، ''خضر راہ'' اور ''طلوع اسلام'' پر طویل تبصرے کیے ہیں ۔ ان چھ نظموں کا تذکرہ تقریباً چوالیس صفحات میں پھیلا ہوا ہے ۔ مولوی صاحب نے تفصیل سے ان نظموں کو پرکھا ہے اور ان خصوصیات کو اجاگر کیا ہے جن کی بنا پر یہ نظمیں کلام اقبال ہی میں نہیں ، اردو شاعری میں بھی امتیازی حیثیت رکھتی ہیں ۔ اس دور کی شاعری پر مولوی احمد دین صاحب کے خیالات کا خلاصہ یہ ہے :

''اقبال کے اردو کلام کا بہترین حصہ اسی دور کا لکھا ہوا ہے ۔ اس دور میں شاعر حقیقت کا ترجمان ہے اور قدرت کا راز دار ۔ مظاہر قدرت اس کے ساتھ باتیں کرتے ہیں ، وہ ان سے اسرار زندگی سیکھتا ہے اور بسا اوقات انھیں اصول حیات کی تعلیم بھی دیتا ہے اور کمال زندگی حاصل کرنے کے گر بھی بتاتا ہے ۔''[2]

تینوں ادوار کی شاعری کا موازنہ کرتے ہوئے مولوی احمد دین نے بڑی پتے کی بات کہی ہے ۔

''یہ دور شروع سے آخر تک تعمیری کام میں منہمک ہے ۔ شاعر نے دور اول میں ذوق استفہام کی بدولت قدرت سے اصول زندگی اخذ کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کے بار بار تقاضوں پر دور دوم میں قدرت نے اپنے اسرار زندگی کے راز اسے بتائے ہیں اور اب قدرت کے اسرار ، اس کے راز ، اس کے آئین سے واقف ہو کر شاعر نے قوم کے لیے ملت کے قیام و دوام کی غرض سے لائحہ عمل تیار کرنے کی کوشش کی ہے ۔''[3]

۱- اقبال ، ۸۷ ۔
۲- ایضاً ، ۱۳۳ ۔
۳- ایضاً ، ۱۳۰ ۔

اس کتاب کا دوسرا باب ''مضامین کلام'' ہے ۔ اس میں اقبال کی شاعری کے موضوعات پر بحث کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اقبال نے کن کن مسائل کو توجہ کا مرکز بنایا ۔ یہ حصہ چودہ ذیلی عنوانات پر مشتمل ہے ۔ آغاز میں مصنف نے محمد حسین آزاد کا اقتباس (از آب حیات) دیا ہے جس میں یہ توقع کی گئی ہے کہ اردو نظم پر جو یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ عاشقانہ مضامین کے سوا کسی اور مضمون کے ادا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی ، اس کو ہمارے نوجوان دور کریں گے ۔ ایسے نوجوان جو مشرق و مغربی علوم پر قابض ہوں ۔ احمد دین آزاد کے اس خواب کی تعبیر اقبال میں دیکھتے ہیں ۔ انھوں نے اس سلسلے میں حالی ، اکبر اور اقبال کے نظریات پر بحث کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ حالی اور اکبر میں مشرق و مغرب کا ملاپ نظر نہیں آتا - اقبال ، آزاد کی خواہشات کے عین مطابق ہیں کیونکہ ''انھوں نے علوم مشرق و مغربی میں دسترس پیدا کی . . . زمین شعر میں مشرق و مغرب کے سنگم سے وہ آبیاریاں کیں کہ چپہ چپہ پر گل و گلزار کے تختے نظر آنے لگے . . . . اقبال نے ہوس پرستی کی مضمون بندیوں سے آزاد ہو کر رفعت مقاصد اور عالی ہمتی کی فضاؤں میں بلند پروازیاں کیں اور قومی و مذہبی ، اخلاق ، فلسفی ، صوفیانہ اور سیاسی مضامین پر اپنی سحر طرازیوں سے بے بہا موتی پرو کر اردو کے خزانے بھر دیے ۔''[1]

اقبال کے موضوعات سخن کے سلسلے میں احمد دین نے سب سے پہلے یہ بتایا ہے ''کہ کلام اقبال'' میں جس امر کی طرف سب سے زیادہ اشارے ملتے ہیں وہ یہ ہے کہ ساری دنیا ''نور توحید'' کی والہ و شیدا ہو جائے :

''اقبال جہانِ عالم میں توحید کے نعرے سننا چاہتا ہے اور ساری خدائی کو خدائے واحد کا پرستار دیکھنے کا خواہاں ہے ۔ وہ مذہب کی پاکیزگی میں اور اس کے نزدیک مذہب میں وحدانیت کے بغیر پاکیزگی ممکن نہیں ، انسان زندگی کے مدارج اعلیٰ پاتا ہے اور یقین کرتا ہے کہ انسانی ترقی ، اس کی حقیقی ترقی کا (کی) معراج یہی ہے ، یہی پاکیزگی ہے ۔ مادی ساز و سامان چاہے کتنی ہی حیرت اور استعجاب کی نمائشیں کرے ، سطوت و شوکت کے مظاہرے دکھائے ، اس سے حقیقی ترقی میسر نہیں بلکہ اس میں نسل انسان کی تباہی اور ویرانی مضمر ہے ۔ انسان زمین پر اللہ کے نائب کی حیثیت میں ہے اور اس کے فرض منصبی کی ادائیگی میں مادیت کی جھنکار ، گرج اور گونج کا کوئی حصہ نہیں ، کچھ واسطہ نہیں ، یہاں دل کی تطہیر اور روح کی پاکیزگی درکار ہے ۔''[2]

۱- اقبال ، ۱۴۸ ۔

۲- ایضاً ۔

دوسری اہم بات جو انھیں اقبال میں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اقبال مستقبل کا شاعر ہے ۔ وہ حالی کی طرح ماضی کی داستان تازہ کر کے رلاتا نہیں اور نہ اکبر کی طرح محض تہذیب حاضر کا مذاق اڑانے پر اکتفا کرتا ہے ''بلکہ وہ مستقبل اور ایک شان دار مستقبل ، عقیدت کی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اور اپنے مدہوش اور گم کردہ راہ بھائیوں کو اس مستقل کے جلوے دکھا کر اور تہذیب نو کی نظر فریبیوں سے ہٹا کر اسلام کی شاہ راہ پر لے چلنے پر مصر ہے ۔''[1] موجودہ دور کے ایک ممتاز نقاد نے حالی ، اکبر اور اقبال کے بارے میں یہی بات دوسرے الفاظ میں کہی تھی جسے بڑی شہرت حاصل ہوئی تھی ، لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ احمد دین ہی وہ نقاد ہے جس نے سب سے پہلے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ۔ ان تینوں شاعروں نے ہماری قومی زندگی میں جو کردار ادا کیا ہے اس کی صراحت احمد دین سے بہتر کسی نے نہیں کی یعنی یہ کہ حالی ، اکبر اور اقبال بالترتیب ماضی ، حال اور مستقبل کے شاعر ہیں ۔ احمد دین کو اقبال میں ایک خصوصیت یہ بھی نظر آتی ہے کہ اس کی حاسۂ باطنی حالات اور واقعات ظاہری کو دل کی آنکھوں سے دیکھتی ہے ۔ اس کا مشاہدہ حقیقت کو بے نقاب پاتا ہے اور اس کا کلام راز حقیقت کے انکشافات سے لبریز ہے[2] اور اس طرح وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اقبال صحیح معنوں میں تلمیذ الرحمٰن ہے کیونکہ اس کی بہت سی باتوں کو جو آئندہ زمانے سے متعلق تھیں ، وقت نے صحیح ثابت کر دکھایا اور اس طرح ''اقبال آنے والے دور کا شاعر ہے ۔ اس کی آنکھوں پر اسرار حیات آشکار ہیں اور راز حقیقت عیاں ۔''[3]

احمد دین نے اقبال کے فلسفۂ خودی پر بھی ایک نظر ڈالی ہے اور ''خودی ، خودداری اور خود افزائی'' کا عنوان قائم کر کے کسی حد تک فلسفۂ خودی کی افہام و تفہیم کی کوشش کی ہے ۔ اگرچہ اقبال کے فارسی کلام کو نظر انداز کر کے صرف اردو کلام کی مدد سے اقبال کے نظریۂ خودی کی وضاحت ممکن نہیں ، لیکن احمد دین نے اردو نظموں کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے وہ بڑی حد تک اقبال کے نظریے کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے ۔

کلام اقبال کی سب سے اہم خصوصیت ''پیغام عمل'' ہے ۔ احمد دین نے بتایا ہے کہ یہی پیغام کلام اقبال کی اصل روح ہے اور اس کی گونج شروع سے آخر تک سنائی دیتی ہے ۔ مختصر یہ کہ اقبال کے مذہب میں عمل زندگی کا اصل اصول ہے اور اس کے نزدیک ہماری روحانی ترقی اور تنزل بھی عمل سے ہی وابستہ ہے ۔ بہشت

۱- اقبال ، ۱۵۴ - ۲- ایضاً ، ۱۵۷ -
۳- ایضاً ، ۱۶۰ -

کی نعمتیں ، دوزخ کا عذاب اسی عمل کا نتیجہ ہے ۔[1]

کلام اقبال میں مذہب کو جو اہمیت حاصل ہے وہ ظاہر ہے ۔ مسلمانوں کی ''زبون حالی'' پر جتنے آنسو انہوں نے بہائے ہیں اور ان کے خوش گوار مستقبل کے خواب جس قدر انہوں نے دیکھے ہیں وہ فکر اقبال کی ابتدا بھی ہیں اور انتہا بھی ۔ احمد دین نے ''مذہب'' کا عنوان قائم کر کے ان آنسوؤں اور خوابوں کی نہایت دل کش تصویر پیش کی ہے اور مذہب کے سلسلے میں یہ امر بھی واضح کر دیا ہے کہ اقبال دوسرے مذہبوں کے پیروؤں کی دل آزاری نہیں کرتے ۔

اقبال کے نظام اخلاق پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور ان کے سیاسی نظریات کو بھی تفصیل سے پیش کر کے یہ بتایا ہے کہ اقبال کے نزدیک مغرب کا جمہوری نظام قیصریت ہی کا دوسرا روپ ہے ۔

''اقبال آزادی۔انفرادی اور قومی کا حامی ہے لیکن . . . وہ آزادی کے لیے آئین کی پابندی لازمی سمجھتا ہے ۔ اس کے ذہن میں حریت کی بنیاد اطاعت پر ہے جو آزادی ربط و ضبط سے نفور ہے آزدی نہیں ۔ طغیان ہے اور اس کا انجام معلوم ۔''[2]

تہذیب نو کی خامیوں کی طرف اقبال نے جو اشارے کیے ہیں ، انھیں بھی احمد دین نے پوری طرح واضح کیا ہے اور بتایا ہے کہ اقبال تہذیب نو کی کم عیاری سے پوری طرح واقف ہے اور اپنے ہم مشربوں کو وہ اس تہذیب کے زہر سے محفوظ رکھنا چاہتا ہے ۔

احمد دین نے اقبال کے متصوفانہ خیالات کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ اقبال نے تصوف کی گود میں پرورش پائی تھی اس لیے تصوف سے اس کا دلچسپی لینا فطری رجحان ہے ، لیکن وہ اس تصوف کا قائل نہیں جو انسان کو خود فراموش بنا دے بلکہ اس تصوف کی تلقین کرتا ہے جو عین خودی ہے ۔ تصوف اور فلسفہ و حکمت کا جو گہرا تعلق ہے ، اس کی بنا پر احمد دین نے اقبال کے ان فلسفیانہ خیالات کا جائزہ بھی لیا ہے جو حیات و کائنات کے گوناں گوں مسائل سے متعلق ہیں ۔ زندگی ارر موت کے مسئلے پر بھی اقبال کے خیالات کی وضاحت کی ہے ۔ یہ ساری بحث تقریباً بائیس تئیس صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور آج بھی اقبال کے خیالاب کو سمجھنے میں بڑی مفید ثابت ہو سکتی ہے ۔

آخر میں ''وطنیت'' ، ''عجمیت'' اور ''پان اسلام ازم'' کے بارے میں اقبال کے خیالات کی تشریح علیحدہ علیحدہ عنوانات کے تحت کی گئی ہے ۔ ان بحثوں کا خلاصہ یہ ہے کہ اقبال ''وطن'' کے بت کو ملی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ

۱- اقبال ، ۱۷۰ - ۲- ایضاً ، ۱۶۸ - ۱۶۹ -

سمجھتے ہیں ۔ اس طرح وہ عجمیت سے اپنی بے زاری کا اعلان کرتے ہیں اور ''حجازی تہذیب'' کی پرانی شراب کے پیاسے نظر آتے ہیں ۔ اقبال کے نظریۂ پین اسلام ازم کے بارے میں احمد دین کی رائے یہ ہے :

''کہا گیا ہے کہ اقبال ، اتحاد سیاسیہ ملیہ کا علمبردار ہے ۔ وہ مسلمانانِ عالم کی تنظیم سے ان کا سیاسی اقتدار تختۂ دنیا پر قائم کرنا چاہتا ہے ۔ اقبال کا کلام اگر بغور پڑھا جائے ، ہمیں بتا دے گا کہ اسلامیوں کا سیاسی تسلط اس کی شاعری کا مقصد ہرگز نہیں ۔ اس کا مدعا ، اس کی نغمہ سرائیوں کا موضوع سیاسیات کی چالبازیوں سے کہیں ارفع و اعلیٰ ہے ۔ وہ سیاسیات میں ، اقتصادیات میں ، دنیا کی مادی ترقی میں ، نئی تہذیب کے آرام و آسائش میں ، اس کی شوکت و سطوت میں ، اس کے تجمل و شان میں ، ارتقائے انسانی نہیں دیکھتا ۔ وہ تو عالم موجودات میں حضرت انسان کی عظمت و وقار کے جلوے ، عظمت و وقار جو خلافت الٰہی کے شایانِ شان ہے ، دیکھنے کا خواہاں اور متمنی ہے ۔''[1]

کتاب کا آخری حصہ ''طرز بیان'' ہے جو انیس ذیلی عنوانات میں تقسیم ہے ۔ سب سے پہلے فاضل نقاد نے یہ بتایا ہے کہ اقبال اگرچہ روایتی عشق و محبت اور بوالہوسی سے اپنے پیشروؤں ، حالی اور اکبر کی طرح ، سخت متنفر ہیں لیکن انھوں نے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے عشق و محبت کی قدیم اصطلاحات اور رموز و علائم سے پورا پورا استفادہ کیا ہے ۔ قدیم شاعروں کی طرح ان کے ہاں بھی گل و گلزار ، رنگ و بُو ، ساقی و مینا اور رقص و سرود کی علامتیں موجود ہیں لیکن اقبال نے ان علامتوں کو ایک نئی معنویت دی ہے ۔ اقبال قدیم شاعروں کی رنگین بیانی کا شیدائی ہے اور اس رنگین بیانی کے ذریعے وہ ان خیالات کو پیش کرتا ہے جن کا قدیم شاعروں سے کوئی تعلق نہیں ۔ اس سارے معاملے کی وضاحت یوں کی گئی ہے :

''بوالہوس قوم سو سال سے ہوس بازی میں مشغول اور کئی سو سال سے عیش پرستی اور غفلت و سکون کی زندگی کی مفتون ہو رہی تھی ۔ مذاق بگڑے ہوئے تھے ۔ قوم کے مایہ ناز چشم فتاں کے مجروح ، خم ابرو کے شہید ، بے کار ، نادار ، مئے پندار سے سرشار ، غفلت کی شراب سے مخمور ، دنیا و مافیہا سے بے خبر اور زمانہ کی چال سے نا آشنا بے اعتنائی کے سرور میں پڑے تھے اور ان حالات میں شنوائی اور کام کی بات کی شنوائی مشکل نظر آتی تھی ۔ فلسفی دماغ نے سامعین کے مذاق کو ملحوظ رکھنے میں حکم تاثیر دیکھا ۔ قوم کو اس خواب غفلت سے جگانا ضروری تھا ان کی ان سرمستیوں سے انھیں ہوش میں لانا لازمی تھا ۔ تقاضائے وقت سے وہی پرانی مجلسیں گرما دیں ۔ وہی راگ ، وہی رنگ ، وہی ساقی ، وہی مینا ،

۱- اقبال ، ۲۱۱ ۔

وہی شکوے اور وہی شکایتیں ہونے لگیں ۔ سونے والے جو پہلے ہی سے حالی کے نالوں اور اکبر کی چٹکیوں سے کچھ کچھ جاگ رہے تھے اپنے پرانے مذاق کے موافق حسن و عشق کی سریں سن کر اٹھ بیٹھے ہیں اور شاعر یقین کرتا ہے کہ یہ لوگ زبان کی چاشنی سے لذت پا کر نئے مذاق کی حقیقت سے آپ ہی آشنا ہو جائیں گے ، میدان سعی میں نکل آئیں گے ، اسلام کی روایات کو سامنے رکھ کر خلوص کے راستے پر قدم بڑھائیں گے اور محبت و اخوت کے نقش پہنائے عالم میں جما دیں گے ۔ اقبال اعلیٰ قومی جذبات بیان کر رہا ہوتا ہے اور وہی ہوس بازی کی اصطلاحیں ، وہی حسن و عشق کی زبان ، وہی استعارے ، وہی تشبیہیں ، وہی رنگ ، وہی راگ ، وہی سریں استعمال کرتا ہے ۔''[1]

اقبال کی ''خیال بندی'' کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کی چند نظموں ''نیا شوالہ'' ''شمع و شاعر'' اور ''شکوہ و جواب شکوہ'' کا حوالہ دیا گیا ہے ۔ دو مختصر نظمیں ''ایک پرندہ اور جگنو'' اور ''حقیقت حسن'' درج کر کے اقبال کی بلند خیالی کی مثالیں پیش کی گئی ہیں ۔ اس سلسلے میں مولوی صاحب کا انداز تنقید سراسر تاثراتی ہے ۔ انھوں نے ''بلند خیالی'' کا تجزیہ کچھ زیادہ گہرائی سے نہیں کیا ۔ اقبال کی مشکل پسندی کو انھوں نے غالب کا اثر بتایا ہے ۔ اس سلسلے میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے ، وہ حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے ۔ شیخ عبدالقادر نے ''مخزن'' میں اس موضوع پر جو لکھا تھا ، اسے درج کرنے کے بعد احمد دین لکھتے ہیں :

''اہل بینش بخوبی سمجھتے ہیں کہ اقبال کا خطاب عوام کو نہیں وہ صرف انھی لوگوں کو مخاطب کر رہا ہے جو اہم امور ملیہ کے سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں ۔ وہ جذبات عامہ کو نہیں بھڑکاتا ۔ شورش اس کا مقصد نہیں ۔ فوری انقلاب میں وہ فلاح قومی نہیں دیکھتا ۔ وہ نمو کا قائل ہے ۔ وہ دماغ کی اعلیٰ ترین تحریکوں سے دل کے افضل ترین ولولے ابھارتا ہے ۔ دل اور دماغ کی اشتراکی قوت عمل سے کمال انسانیت کے جلوے دکھانا چاہتا ہے ۔ اس کے خیالات عالم روحانیت کے پرتو ہیں اور عوام ان کے فہم و ادراک سے قاصر ہیں اور اس کی زبان بھی خیالات کے مطابق دقیق ہوتی ہے اور ہر ایک آدمی کو اس سے حظ اٹھانا میسر نہیں لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اقبال کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے اسلوب بیان کے لیے موقع اور محل ملحوظ رکھتا ہے ۔ اگر مضمون دقت طلب ، اہم ہے اور رہنمایان قوم ہی مخاطب ہیں تو اس کی زبان مشکل اور دقیق نظر آئے گی ۔ اگر وہ عوام کو کوئی بات سمجھانا چاہتا ہے تو اس وقت اس کا کلام عام فہم ہوتا ہے ۔''[2]

۱۔ اقبال ، ۲۱۷ ۔
۲۔ ایضاً ، ۲۲۶ - ۲۲۷ ۔

احمد دین نے اقبال کی مشکل گوئی اور سادہ بیانی کے سلسلے میں بتایا ہے کہ ''شکوہ'' اور ''جواب شکوہ'' اس لیے آسان زبان میں ہیں کہ ان کا تعلق عام مسلمانوں کے جذبات سے ہے ۔ ''شمع و شاعر'' کا تعلق عام مسلمانوں سے نہیں ، ان مسلمانوں سے ہے جو قوم کی رہنمائی کرتے ہیں ۔ اس لیے اس کا اسلوب بدلا ہوا ہے ۔ اس کے بعد کلام اقبال میں ''شوکت بیان'' ، ''سوز و گداز'' ، ''تشبیہات و استعارات'' ، ''جوش'' ، ''طرفگی بیان'' اور ''موسیقیت'' کے عناصر کی نشان دہی کی گئی ہے ۔ ''امید'' کا عنوان قائم کر کے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اقبال کسی عالم میں مایوس نہیں ہوتے ۔ ان کے کلام میں ''نا امیدی کی سریں اور آہ و بکا کم یاب ہے اس کے نالے بھی نئے انداز کے ہوتے ہیں ۔ اسے شام غم بھی صبح امید کی خبر دیتی ہے اور ظلمت شب میں اسے امید کی کرن نظر آتی ہے ۔''[1]

طرز بیان کے سلسلے میں احمد دین نے سب سے اہم بحث اس موضوع پر کی ہے کہ اقبال مناظر قدرت اور مادی دنیا سے اخلاقیات ، معاشرت اور سیاسیات کے زرین اصول اخذ کرتا ہے اور مسائل فلسفہ کے ایسے نکات کا استدلال کرتا ہے ، جن سے عقل حیران رہ جاتی ہے ، مضمون آفرینیاں دلفریب اور حیرت‌انگیز ہیں[2] ۔ اس موضوع پر احمد دین نے جو کچھ لکھا ہے ، وہ ان کی نقادانہ بصیرت کی ایک نہایت عمدہ مثال ہے ۔ کلام اقبال کے اس پہلو پر آج تک کسی نقاد نے اس انداز سے روشنی نہیں ڈالی ۔ احمد دین نے تفصیل سے بتایا ہے کہ اقبال جب بھی کسی قومی و ملکی مسئلے پر یا انسانی زندگی کے کسی پہلو پر اظہار رائے کرتے ہیں اور انسانی فطرت کی پیچ در پیچ گتھیوں کو سلجھاتے ہیں تو خود فطرت ہی ان کے لیے ایسی مثالیں مہیا کر دیتی ہے جن سے ان کے شاعرانہ مطالب کو سمجھنے میں بڑی آسانی پیدا ہو جاتی ہے ۔ دریا ، قطرہ ، درخت کی سوکھی ٹہنی ، شبنم ، گوہر وغیرہ کے استعارے ، قومی اتحاد اور انسانی نفسیات کے بیان میں بڑی وضاحت پیدا کر دیتے ہیں ۔ اس طرح ''پھول'' کا استعارہ بھی ''چشم بینا اور گوش شنوا کے لیے اسباق کا ایک دفتر کھولے ہوئے ہے'' ۔ اقبال کو حیات انسانی کے مختلف مراحل میں جو کیفیات نظر آتی ہیں ان کے اظہار کے لیے بھی خصوصیات گل یعنی خود فروشی ، خود نمائی اور خود فراموشی وغیرہ کا سہارہ لیا جاتا ہے ۔ اسی طرح گل و گلزار کے تمام متعلقات شعر اقبال میں بہاراں کا سماں پیدا کر دیتے ہیں ۔ علو ہمتی کے بیان کے لیے بھی اقبال نے جو مثالیں دانہ ، خاک ، روئیدگی ، بالیدگی پیش کی ہیں وہ بھی آغوش فطرت ہی سے مستعار لی ہیں ۔ خودداری کے لیے بھی اقبال حباب ہی کی مثال پیش کرتے

۱- اقبال ، ۲۴۲ ۔ ۲- ایضاً ، ۲۴۴ ۔

ہیں جو دریا میں بھی اپنا پیمانہ نگوں رکھتا ہے ۔ اس طرح وہ موج اور دریا کی علامتوں سے قومی اتحاد کا پہلو نکالتے ہیں ۔ سادہ زندگی بسر کرنے اور ذوق عمل پیدا کرنے کے لیے بھی اقبال نے بحر و بیابان کی وسعتوں سے استفادہ کیا ہے ۔ مختصر یہ کہ اقبال نے اپنا سارا فلسفہ فطرت کے مظاہر کے ذریعے پیش کیا ہے ۔ صبح و شام ، دوپہر ، رات ، سورج ، چاند اور ستارے آسمان یہ سب اقبال کے محبوب استعارے ہیں اور ان مظاہر کی کیفیات اور انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں مماثلت اور مطابقت کی نشاندہی کر کے اقبال نے اپنے سلسلۂ سخن کو مؤثر و دلنشیں بنایا ہے ۔ احمد دین نے یہ بھی بتایا ہے کہ اقبال نے مظاہر فطرت کو محض ایک وسیلے کے طور پر استعمال نہیں کیا ، بلکہ ایک بلند پایہ مصور کی طرح ان کی تصویرکشی بھی کی ہے جس سے حسن فطرت اور بھی کچھ نکھر جاتا ہے ۔ اقبال کی واقعات نگاری اور جذبات نگاری کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے ۔ اس سلسلے میں ''غلام قادر روہیلہ'' ، ''آفرینش محبت'' اور ''عشق اور موت'' کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ اقبال کو جذبات نگاری میں زبردست کمال حاصل تھا ۔ آخر میں ''اردو اور اہل پنجاب'' کے عنوان سے خود اقبال اور مولانا اسلم جیراج پوری کے مضامین سے اقتباسات پیش کر کے اُن اعتراضات کے جواب میں ، جو اقبال کی زبان پر کیے گئے تھے ، اقبال کی پختگیٔ بیان کو واضح کیا گیا ہے ۔ آخر میں ''اقبال اور ابنائے وطن'' کے عنوان سے اقبال کی اس شکایت کو پیش کیا ہے کہ مضامین کلام سے ابنائے وطن بے التفاتی کرتے ہیں اور پیام مشرق کے وہ فارسی اشعار نقل کیے ہیں جن میں اقبال نے یہی شکوہ خود اپنی زبان میں کیا ہے ۔ اس طرح اقبال کے اردو کلام کے بارے میں یہ کتاب اقبال کے فارسی اشعار پر ختم ہو جاتی ہے ۔

احمد دین کی یہ کتاب ایک بہت بڑا تنقیدی کارنامہ ہے ۔ اردو تنقید کی تاریخ لکھنے والوں نے احمد دین کو کبھی قابل التفات نہیں سمجھا حالانکہ وہ ہر اعتبار سے اردو کے نقادوں میں ایک ممتاز جگہ پانے کے مستحق ہیں ۔ ان کی یہ تصنیف عملی تنقید کی ایک عمدہ مثال ہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ احمد دین تنقید میں تشریحی و تاثراتی انداز اختیار کرتے ہیں لیکن وہ اقبال کو اس کے عہد اور ماحول سے الگ کر کے نہیں دیکھتے ۔ انھوں نے اقبال کی شاعرانہ عظمت کا تجزیہ کرتے ہوئے ہر موقع پر اُن معاشرتی و سیاسی حالات کو بھی پیش نظر رکھا ہے جن میں اقبال کی ذہنی نشو و نما ہوئی تھی ۔

احمد دین نے یہ کتاب ایک ایسے زمانے میں لکھی جبکہ اردو تنقید کا سرمایہ ہی محدود تھا ۔ اس طرح انھوں نے اردو کی تنقیدی روایت کو آگے

بڑھانے میں ناقابل فراموش کردار ادا کیا ہے ۔ یہ کتاب اس نقطہ نظر سے بھی اہمیت رکھتی ہے کہ اردو میں پہلی بار اس کتاب کے ذریعے کسی شاعر کی فنی خوبیوں کو اجاگر کیا گیا ہے ۔ اس سے پہلے شعرا کے بارے میں مختلف مضامین تو نظر آ جاتے ہیں لیکن کوئی مستقل کتاب نہیں ملتی ۔ اقبال کے فن کا پہلا سیر حاصل جائزہ ہونے کی وجہ سے بھی اس کتاب کی اہمیت بڑھ جاتی ہے ۔ مولوی احمد دین پہلے نقاد ہیں جنھوں نے اقبال کے کلام کا ایسا تفصیلی تجزیہ پیش کیا جس نے بعد کے لکھنے والوں کے لیے ایک رہنما کا فرض انجام دیا ۔ یہ دوسری بات ہے کہ استفادہ کرنے والوں نے اس کتاب کا حوالہ دینے کو اپنے شایان شان نہ سمجھا ۔

مولوی احمد دین اور اقبال کے تعلقات کے پیش نظر یہ ممکن تھا کہ مولوی صاحب بلا وجہ اپنے ممدوح کی مدح سرائی کرتے لیکن ان کی کتاب اس عیب سے پاک ہے ۔ انھوں نے کہیں ، کسی جگہ اقبال کی بے جا تعریف نہیں کی نیز اپنی عقیدت کو مبالغے کا لباس نہیں پہنایا ۔ انھوں نے جو بات بھی کہی ہے ، مدلل انداز سے کہی ہے اور اسی بنا پر یہ کتاب آج بھی اقبال فہمی کے لیے ایک مفید دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے ۔

ضمنی طور پر اس کتاب میں حیات اقبال کے بعض پہلوؤں پر بھی روشنی پڑتی ہے ۔ خصوصاً اقبال کی ابتدائی ادبی زندگی کے بارے میں بڑی قیمتی معلومات ہیں ۔ لاہور کی ادبی محفلوں اور حمایت‌الاسلام کے جلسوں میں اقبال کی مقبولیت کے بارے میں مولوی صاحب نے عینی شاہد کی حیثیت سے جو کچھ لکھا ہے ، وہ ان کے سوانح نگار کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے ۔

یہ کتاب جب شائع ہوئی تھی تو برصغیر ہند و پاکستان کے علمی و ادبی حلقوں میں اس کا خاصا چرچا ہوا تھا ۔ اردو کے کئی ممتاز لکھنے والوں نے مختلف رسائل میں اس پر تبصرے کیے تھے ۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے بھی رسالہ ''اردو'' بابت اکتوبر ۱۹۲۶ع میں ایک مفصل تبصرہ لکھا تھا ۔ انھوں نے دبے لفظوں میں اس کتاب پر اعتراض کیا تھا کہ ''یہ تنقید نہیں بلکہ اقبال کی شاعری کے محاسن ہیں'' ۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مولوی احمد دین نے کلام اقبال کی خامیوں سے بحث نہیں کی لیکن اس کتاب کو دائرۂ تنقید سے خارج کرنا اور اسے محض ''محاسن شماری'' بنانا بھی درست نہیں ۔ شاید یہاں بابائے اردو مرحوم نے لفظ ''تنقید'' کو نہایت محدود معنوں میں استعمال کیا ہے ورنہ ان جیسے بالغ نظر سے ایسی رائے کی امید نہیں ہو سکتی ۔

اسلوب بیان : مولوی احمد دین کی تصانیف سے بہت سے اقتباسات اس

مقالے میں دیے گئے ہیں جن سے مولوی صاحب کے اسلوب اور انداز تحریر کا اندازہ ہو سکتا ہے ۔ مولوی صاحب نے سوانح ، تنقید ، ادب ، تاریخ ، انشائیہ ، ناول اور لسانیات جیسے موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے ۔ لیکن موضوعات کی اس بوقلمونی کے باوجود ان کے اسلوب میں کسی قسم کی ناہمواری پیدا نہیں ہوتی اور وہ اپنے استاد محمد حسین آزاد کی روش پر چلتے ہوئے ہر میدان میں اپنی انشا پردازی کا لوہا منواتے ہیں ۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں مولانا آزاد کے اسلوب کی کامیاب پیروی کی ہے اور بعض جگہ تو ان کی تحریروں پر آزاد ہی کی تحریر کا گمان ہوتا ہے ۔ مثلاً بازار حکیماں کی ادبی محفلوں سے متعلق جو اقتباس اوپر دیا گیا ہے وہ بالکل ''آب حیات'' کے رنگ کا ہے یا ''راز و نیاز'' کا محولہ بالا اقتباس ''نیرنگ خیال'' کے اسلوب کی غمازی کرتا ہے ۔ مولوی احمد دین نے آزاد کی محض نقالی نہیں کی بلکہ ان خصوصیات کو اپنانے کی کامیاب کوشش کی ہے جو آزاد کی نثر کا طرۂ امتیاز ہیں ۔

احمد دین نے تاریخی تحریروں میں ''سادہ بیانی'' ہی سے کام لیا ہے لیکن ان کے اسلوب کی نمائندہ تصانیف ''اقبال'' اور ''سرگزشت الفاظ'' ہیں ، وہ زور بیان پیدا کرنے کے لیے مترادفات کا استعمال بڑے سلیقے سے کرتے ہیں اور کہیں کوئی لفظ غیر ضروری محسوس نہیں ہوتا ۔ جہاں انھیں کوئی اخلاقی یا قومی مسئلہ پیش کرنا ہوتا ہے وہاں وہ اپنا زور بیان خوب دکھاتے ہیں ۔ آزاد کی طرح مسائل کو تمثیلی انداز سے پیش کرنے میں بھی انھیں کمال حاصل ہے ۔ اس کی بہترین مثال ان کا انشائیہ ''راز و نیاز'' ہے جس کی تفصیل سطور بالا میں پیش کی جا چکی ہے ۔ بعض اوقات وہ علمی مباحث میں ایسا پیرایہ اختیار کرتے ہیں جس سے تحریر میں گفتگو کا سا انداز پیدا ہو جاتا ہے ۔ قاری کو بار بار مخاطب کر کے بھی وہ کتاب کی علمی فضا کو ''ذاتی رنگ'' دے دیتے ہیں ۔

فہرست مخطوطات کتاب خانہ

خواجہ عبد الرشید ، کراچی

اخلاق محسنی/حسین واعظ کاشفی/فارسی :

مکمل ، نہایت خوش خط ، مُطلّا ، شاہ اسماعیل صفوی کے کتب خانہ کا نسخہ ہے ، چنانچہ سرورق پر لکھا ہے : ''کتاب حسن خلق از کتاب خانہ شاہ اسماعیل صفوی است'' دو تین مہریں بھی ہیں جو پڑھی نہ جا سکیں - سائز "$9\frac{1}{2}$ × "6 - سطر فی صفحہ بارہ - آخر میں یہ عبارت لکھی ہے : ''اخلاق محسنی بتمامی نوشتہ شد - تاریخ ہم بجوی ز اخلاق محسنی'' اس تحریر سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانے کی یہ کتاب لکھی ہوئی ہے ، اسی سال میں اس کی کتابت بھی ہوئی ہے - اخلاق محسنی کے اعداد ۹۰۰ ہوتے ہیں لہٰذا اس کی کتابت بھی ۹۰۰ میں ہوئی ہوگی - کاغذ اور تحریر سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ اسی زمانے کا مخطوطہ ہے - جلد اصلی چرمی منقش ، حالت عمدہ -

اخلاق ناصری/محمد ابن الحسینی الطوسی/فارسی :

خوشخط نستعلیق ، کاغذ ، لاہوری کتابت فتح خاں ملتانی ، تاریخ کتابت ۱۰۶۸ھ - سائز "8 × "5 - سطر فی صفحہ پندرہ - کل تعداد اوراق : ۲۰۲ - حالت عمدہ ، مجلد چرمی -

اخلاق ناصری/محمد ابن الحسینی الطوسی/فارسی :

مکمل ، خوشخط ، کاغذ لاہوری ، اوراق ۲۰۲ ، سطر فی صفحہ ۱۵ ، سائز "$4\frac{1}{2}$ × "8 مجلد ، جلد ناقص ، حالت عمدہ ، نستعلیق - بخط فتح خاں ساکن ملتان - تاریخ کتابت ۱۰۶۸ھ -

اخلاق ناصری اگرچہ خواجہ نصیر ابن طوسی کی تصنیف ہے لیکن ان کا نام نہیں لکھا -

الوسائل الی المسائل/احمد بن علی بن احمد ملقب بمعین/عربی و فارسی مخلوط :

خط نسخ میں یہ کتاب الوسائل الی المسائل بڑی خوشخط لکھی ہے ، مطلا ہے - جلد اصلی چرمی منقش ، سائز "9 × "7 مکمل ، قرائن سے کتاب کی قدامت کا پتہ چلتا ہے جو کہ دسویں صدی ہجری کے وسط کی ہے -

انشائے عنوان نامہ/مولف نامعلوم/فارسی :

مکمل ، خستہ مگر مرمت شدہ اوراق ، کاغذ خستہ مگر محفوظ ، مجلد ، خط شکستہ آمیز کسی استاد کے ہاتھ کا لکھا ہوا مخطوطہ ہے ۔ خطوط امرأ وزرا کے نام ہیں ۔ سائز $7\frac{1}{2}'' \times 4''$ ۔ کل اوراق ۴۰ ، سطور ۱۴ فی صفحہ ، ہر مکتوب پر قرمزی‌عنوان درج ہے ۔ کاتب کا نام اور تاریخ کتابت درج نہیں ۔

آخر کے خط میں یہ شعر لکھا ہے :

توی قاصد بہرعنوان کہ دانی شرح حالم کن
جواب نامہ دشوار است پیغام زبانی ہم

انیس المسکین/ مزمل شاہ/پنجابی :

علاج الامراض پر پنجابی نظم میں ایک رسالہ ۔ ضخامت سات اوراق ۔ سائز $5\frac{1}{2}'' \times 12\frac{1}{2}''$ ۔ تعداد اشعار فی صفحہ چودہ ۔ کاغذ لاہوری خستہ ۔

بلد الامین والدرع الحصین/محمد بن محمد التقی المدعوبہ باقر/عربی :

نہایت خوشخط نسخ میں لکھا ہوا مخطوطہ ہے ، مُطلّا ، عنوان قرمزی ، یہ ابراہیم بن علی الحسین الکفعمی کے اوراد ہیں ۔ ہر صفحہ پر دس سطریں ہیں ۔ سائز $5'' \times 7''$ ۔ جلد چرمی ناقص ، اوراق بارہ ، آخر کتاب ندارد ۔ کاغذ قمّی ۔ قدامت نسخہ دسویں صدی ہجری ،کتابت کی تاریخ موصور نہیں ، البتہ نام کاتب شروع میں یوں درج ہے ''بخط الشیخ محمد بن ادریس'' ۔

بیاض/صاحب بیاض کا نام ندارد/فارسی :

مندرجہ ذیل رسائل پر مشتمل ہے :

۱۔ شرح رباعیات ملا عبدالرحمٰن جامی ۔
۲۔ رسالہ کاشف الاسرار امیر کبیر سید میر علی ہمدانی ۔
۳۔ منتخبات خواجہ عبداللہ انصاری ۔
۴۔ رباعیات سرمد ۔
۵۔ کلام حضرت ملا شاہ بدخشی مشتملبر ۱۳۳ رباعیات غیر مطبوعہ ۔
۶۔ شطحات صوفیاء کرام ۔

تمام رسائل مختلف کاتبوں کے لکھے ہوئے ہیں ۔ مجموعی طور پر تمام خوشخط ہیں مگر خط شکستہ میں لکھے ہیں ۔ رباعیات حضرت ملا شاہ اور شطحات کسی اچھے خطاط کے لکھے ہوئے ہیں ۔ سائز $9'' \times 5''$ ۔ سطریں مختلف ، کچھ ترچھی ، کچھ حاشیے پر ۔ تعداد اوراق ۳۱ ۔

جہاں سے حضرت ملا شاہ کا کلام شروع ہوتا ہے وہاں لکھا ہے ''من کلام حقائق و معارف آگاہ ملا شاہ ، انتخاب بکتاب خودش''۔

ایک صفحہ پر نقل لکھی ہے اور اس کے نیچے لکھا ہے : ''از دارا شکوہ قدس سرہ'' مجموعی طور پر مخطوطہ عمدہ ، مجلد ، کاغذ مختلف الانواع ۔ قدامت بارھویں صدی ہجری ۔

بے سرنامہ/مصنف ندارد/فارسی :

مکمل، نظم ، تاریخ کتابت ۱۲۱۹ھ ، نام کاتب و مصنف ندارد ۔ کاغذ لاہوری، اوراق ۸ ، کل اشعار ۱۷۶ ، سائز $5\frac{1}{2}'' \times 8'$ ، مجلد ، حالت عمدہ ، خط اوسط ۔

تاریخ کلام الملوک/میرزا محمد یوسف لاھیجی/فارسی :

تاریخ کلام الملوک کا ایک جزو جس میں خطاطوں کا تذکرہ ہے ۔ اصل کتاب یقیناً بہت ضخیم ہوگی ۔ اس جزو کے نو اوراق ہیں ۔ ہر صفحہ پر آٹھ سطریں ہیں ۔ خط نہایت اعلیٰ قسم کا نستعلیق ہے ۔ کسی اُستاد کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ ہے ۔ سائز $5'' \times 8''$ ہے ۔ جزو مطلا ہے ۔ کاغذ اصفہانی ہے اور نہایت عمدہ حالت میں ہے ۔ مجلد ، یہ مخطوطہ خطاطی کا شاہ کار ہے ۔ قدامت نسخہ گیارھویں صدی ہجری ۔ نام کاتب اور تاریخ کتابت موجود نہیں ۔

تبصرۃ العوام/میر مرتضیٰ/فارسی :

پورا نام کتاب تبصرۃ العوام فی مقالات الانام ۔ سائز $5'' \times 9''$ ، سطر فی صفحہ ۱۴ ۔ مجلد ، مکمل ، حالت عمدہ ، کاغذ مشہدی ، نام کاتب میر قاسمی ولد امیر امان اللہ مشہدی ۔ تاریخ کتابت ۴۸ھ ۔ یہ شاید سن جلوس ہے جو برابر ہوتا ہے ۱۰۸۸ھ ۔ کے

ترجیعات مغربی/مولانا مغربی/فارسی :

اس جلد میں ترجیعات مولانا مغربی کی نثر اور نظم دونوں شامل ہیں ۔ اس کے ساتھ شروع میں مولانا جامی کی مثنوی ''مخزن الاسرار'' بھی شامل ہے ۔ خط نستعلیق اور نہایت خوشخط ۔ اوراق ۱۷۳، سطر فی صفحہ ۲۰، نظم و نثر یکساں ۔ سائز $3\frac{1}{2}'' \times 6\frac{1}{2}''$ ۔ مجلد ، حالت عمدہ ، کاغذ ہراتی ، تاریخ کتابت ۱۲۶۱ھ ۔

تحفۃ الزائر/محمد باقر بن محمد تقی/فارسی :

مکمل ، مطلا ، کاغذ کاشانی ، سائز $5'' \times 8''$ ۔ خوشخط اعلیٰ ، نسخ ۔ نام کاتب میرزا فخرالدین طباطبائی ، بہاءالدین جندق ، سن کتابت ۱۲۲۷ھ ، مجلد ، جلد چرمی ، حالت عمدہ ، سطر فی صفحہ ۱۸ ۔

جلاءالعیون/محمد باقر ابن محمد تقی/فارسی :

مکمل ، خط نستعلیق اوسط درجہ ، کاغذ قمی ، کتابت عباس علی ، تاریخ کتابت ۱۲۴۲ھ سائز $11\frac{1}{2}'' \times 7\frac{1}{4}''$ ، سطر فی صفحہ ۲۳ ، مجلد ، جلد چرمی ، حالت عمدہ ۔

جمع التعلیلات الصرف/مصنف نامعلوم/فارسی :

مکمل ، یہ رسالہ اصل کتاب کا اختصار معلوم ہوتا ہے کیونکہ آخر میں لکھا ہے ، ''من کہ کاتب این کتابم و حروفم از اصل رسالہ مختصر کردم چرا در جلد مہا مکروہ بودند'' ۔ کاتب کا نام موجود نہیں اور نہ ہی تاریخ کتابت ، البتہ کتاب کے سب سے آخر میں یہ عبارت کسی دوسرے ہاتھ سے لکھی ہوئی ہے بپاس خاطر برخوردار نبی بخش تحریر یافت تحریر بتاریخ پنجم شہر جمادی الثانی ۱۲۶۳ھ مقدس ، سائز $10'' \times 5''$ ، سطر فی صفحہ ۱۷ ، کاغذ لاہوری ، حالت عمدہ ، مجلد ۔

حدیقہ/حکیم سنائی/فارسی :

مکمل ، کاغذ خستہ ، خوشخط ، کاتب کا نام و تاریخ کتابت ندارد ، قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ کتابت و کاغذ دسویں صدی ہجری کے وسط کا ہے ۔

سائز : $7'' \times 4''$ ، اوراق ۳۶۸ ، سطور فی صفحہ ۱۷ ۔ عنوان قرمزی ، مجلد ، جلد اصلی چرمی ۔

حکایات/مصنف ندارد/فارسی :

مجموعہ حکایت فارسی در نظم ، اول و آخر پیدا نیست ، نام کاتب و مصنف ندارد ۔ اوراق ۱۲۲ ، سائز $8'' \times 5''$ ۔ سطر فی صفحہ ۱۲ ۔ کاغذ طہرانی ، حالت عمدہ ، مجلد ، خوشخط ، نستعلیق ، عنوانات قرمزی ، قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ گیارھویں صدی ہجری کی کتاب ہے ۔

دبستان مذاہب/محسن خانی/فارسی :

اوراق ۲۴۸ ، فارسی خط معمولی نستعلیق ۔ کاغذ نیلا ، سائز $13'' \times 7\frac{1}{2}''$ ، سطریں ۲۸ فی صفحہ ، نام کاتب ندارد ، حالت عمدہ غیر مطلا ۔

دیوان برہمن/چندر بھان/فارسی :

مکمل ، مجلد ، محفوظ ، عمدہ کتابت ، اوسط درجہ بخط کیتل داس تاریخ کتابت ۱۱۰۳ھ ، دیوان کے آخری صفحہ پر یہ عبارت لکھی ہے : ''تمت تمام شد کار من نظام شد نسخہ دیوان برہمن فی التاریخ ہفتم شہر ذی القعد ۳ جلوس میمنت مانوس بادشاہ عالم پناہ احمد شاہ غازی خلداللہ ملکہ و زبداللہ سلطانہ مطابق ۱۱۰۳ع یک ہزار یک صد و سہ ہجری بخط کاتب الحروف کیتل داس در بلدہ عظیم آباد بصوبداری نواب معلیٰ القاب علی وردیخان بہادر مہابت جنگ تحریر یافت'' ۔

کل اوراق ۸۸ ، سطریں ۱۵ فی صفحہ سائز "9 × "$5\frac{1}{2}$ -

صفحہ ۱ سے لے کر ۶۱ تک غزلیات ہیں جن کی تعداد ۲۷۴ ہے پھر ۶۳ صفحہ تک رباعیات ہیں جن کی تعداد ۳۷ ہے ۔ صفحہ ۶۴ سے مثنوی شروع ہوتی ہے اور صفحہ ۸۷ پر ختم ہو جاتی ہے کل ۔ اشعار مثنوی ۳۲۵ ہیں ۔ اس دیوان میں کوئی شعر ڈھیلا نظر نہیں آیا ۔ اس نسخہ کی تصحیح کاتب کے اپنے ہاتھ سے ہوئی ہے ۔

یہ دیوان ، گلزار بہار معروف بہ بزم نظم برہمن کے کلیات کلام نظم فارسی سے بہتر اور مکمل‌تر ہے ۔ اس تذکرہ کے مصنف بھگونت رائے سنامی ہیں ، ہمارے والا یہ مخطوطہ غالباً پاکستان میں واحد نسخہ ہے ۔

دیوان بیدل/عبدالقادر/فارسی :

اول و آخر موجود ۔ دیوان فارسی میرزا بیدل مشتملبر ۴۵۲ اوراق سائز "12 × "7 - سطریں ۱۴ فی صفحہ ۔ تعداد اشعار فی صفحہ برمتن چودہ ، تعداد اشعار در حاشیہ ۱۶ ، تعداد کل اشعار بر یک صفحہ ۳۰ ، کل اشعار دیوان ۱۲۰،۲۷ ، تاریخ کاتب و نام کاتب ندارد ۔ کاغذ عمدہ باریک ، قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ نسخہ بارھویں صدی کے اواخر کا ہے ۔

ردیف دال صفحہ ۲۶۰ تک پھیل گئی ہے ، گویا اس ردیف کے کل اشعار ۱۵٬۶۰۰ ہوئے ۔

دیوان حافظ/خواجہ حافظ شیرازی/فارسی :

مکمل ، خوشخط ، نام کاتب و تاریخ کتابت درج نہیں ہے ۔ سائز "9 × "$5\frac{1}{2}$ سطر فی صفحہ ۱۶ ، کاغذ لاہوری ، حالت عمدہ ، مجلد ۔

دیوان حافظ/خواجہ حافظ شیرازی/فارسی :

نامکمل ، از ردیف دال تا ردیف شین ، خوشخط ، کاغذ لاہوری ۔ سائز "8 × "5 - سطر فی صفحہ ۱۲ ۔ حالت عمدہ ، مجلد ، نام کاتب ندارد ۔ تاریخ کتابت ندارد ۔ اغلب یہی ہے کہ تیرھویں صدی ہجری کا لکھا ہوا ہے ۔

ذکرالصلٰوۃ/ابو سلیمان الدوانی/عربی :

مکمل ، کعبہ معظمہ کے در عکس رنگین ، کاغذ سیالکوٹی ، کاتب : غلامی صاحب علوی الحسینی الگجراتی ۔ تاریخ کتابت : ۱۱۹۵ھ ۔ سائز "$8\frac{1}{2}$ × "$4\frac{1}{2}$ - عربی خط نسخ ، سطر فی صفحہ ۱۱ ۔ عنوانات قرمزی ۔ مجلد ، حالت عمدہ ۔

ذکر صلٰوۃ/ابو سلیمان الدوانی/عربی :

کتاب کا پورا نام : دلائل الخیرات و شوارق‌الانوار فی ذکر صلواۃ ۔ کتابت : عبدالرحمان ۔ تاریخ : ۱۱۷۰ ہے ۔ سائز : "$5\frac{3}{4}$ × "3 ، مطلا ، خوشخط ، کاغذ

عمدہ ۔ مجلد ، مکمل ۔ اس میں روضہ مبارک کے دو رنگین اور سنہری عکس موجود ہیں ۔

رسالہ در علم عروض/اُردو :

مصنف کا نام معلوم نہیں ہو سکا ۔ مکمل ، خوشخط ۔ سن تالیف : ۱۳۱۶ھ سن کتابت : ۱۳۲۱ھ ۔ صفحات : ۱۶ ، سطر فی صفحہ ۱۵ ۔ خوشخط ۔

آخر میں یہ عبارت ہے : ''حسب فرمائش عالی جناب فیض مآب مولانا مولوی احمد حسین خاں صاحب امروہی النقشبندی سلمہ اللہ الوابب بتاریخ ۵ محرم‌الحرام ۱۳۲۱ھ ، بقلم محمد عبدالروف نوشتہ شد ۔ فقط'' ۔ مجلد ، عمدہ حالت ۔ آخر میں ایک نہایت عمدہ گردانوں کا چارٹ دیا ہے ۔ غالباً غیر مطبوعہ ۔

رقعات/فارسی :

شکستہ آمیز خط میں پچاس اوراق پر پھیلے ہوئے خطوط ہیں جو کسی بادشاہ کی طرف سے لکھے گئے ہیں ۔ خط استادانہ اور منشیانہ ہے ، ہر ورق کے اُوپر ہوالکافی لکھا ہے ۔ سائز "$5\frac{1}{2}\times 9\frac{1}{2}$" ۔ سطر فی صفحہ ۱۶ ۔ کاغذ خستہ ، متعدد جگہ کرم خوردہ ۔ مجلد ، محفوظ ۔ تاریخ کتابت اور نام کاتب ناپید ۔ قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ رقعات دسویں صدی ہجری کے لکھے ہوئے ہیں ۔

سبحۃ الابرار/عبدالرحمان جامی/فارسی :

معمولی قلمی نسخہ ، مکمل ، مجلد ، سائز : "$3\frac{1}{2}\times 6\frac{1}{2}$" ۔ سطر فی صفحہ ۱۴ ، خط ناقص نستعلیق ، کاغذ دیسی ۔ قدامت مخطوطہ اواخر تیرھویں صدی ہجری ۔

سراج المنیر/فارسی :

مکمل ، خوشخط ، نستعلیق ، عکسی ، باغ رنگین تصاویر ۔ تاریخ کتابت : ۱۲۵۶ھ ۔ سائز : "4×7" ۔ سطر فی صفحہ ۱۴ ۔ مصنف اور کاتب کا نام موجود نہیں ۔ مجلد ، عمدہ حالت ۔

سری کرشنامہ/فارسی :

شری بھگوت نور ادیھائے ۔ نستعلیق فارسی ، معمولی خط ، کاغذ خستہ لاہوری ۔ اوراق ۳۵۸ ۔ غالباً مہابھارت کا ایک مکمل نسخہ ہے جس کا یہ فارسی ترجمہ ہے ، سطر فی صفحہ ۱۲ ۔

۱۶ سن جلوس محمد شاہی دارالسلطنت لاہور میں بخط کلیان رائے لکھا گیا ہے ۔ آخر میں یہ عبارت لکھی ہے : ''تمام شد در تاریخ بیست و یکم ربیع الاول سنہ ۱۶ محمد شاہی . . . . در دارالسلطنت لاہور بد ستخط بندہ کلیان رائے ما دھوک

بتحریر یافت اگرچہ لائق تحریر نہ بود . . . سری کشن بھگوان تحریر یافتہ شد ۔"
سائز : "$5\frac{1}{2}'' \times 8\frac{1}{2}$ ۔

سلک السلوک/ضیاء الدین بخشی/فارسی :

مکمل ، کاغذ سیالکوٹی ، سائز "$9'' \times 5$" ، سطر فی صفحہ ۱۵ ۔ مجلد ، عمدہ حالت ، خوشخط نستعلیق ۔ تاریخ کتابت ۱۱۲۷ھ ۔ کاتب : علی رضا بن السید علی علی رضاء الشیرازی ۔

شاهنامه/فردوسی/فارسی :

مکمل ۔ اوسط درجہ خط نستعلیق ، تاریخ کتابت : ۱۲۵۳ھ ۔ کاتب : ہدایت کرمانی القمی ۔ سطر فی صفحہ ۲۵ ، کالم ۴ عمدہ حالت ، کاغذ مومی ۔ سائز : "$8'' \times 12$" ۔

صحیح بخاری/امام بخاری/عربی :

سائز : "$10'' \times 7$" ۔ اوراق ۳۸۳ ۔ اوسطاً ۱۷ سطریں فی صفحہ ۔ کاغذ سادہ سیالکوٹی ۔ خوشخط نسخ ۔ کتاب الزکواۃ تا باب نزول القرآن و وفات النبی صلی اللہ علیہ وسلم ۔ تاریخ کتابت اور کاتب کا نام دونوں موجود نہیں ۔ متعدد حواشی اردو ، فارسی اور عربی میں لکھے ہوئے ہیں ۔ حواشی کی کتابت مخطوطے کی کتابت کے زمانے کی معلوم ہوتی ہے ۔ قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ کتابت بارھویں صدی ہجری کی ہے ۔ مجلد ، جلد سنہری و اصلی عمدہ ۔

صرف السالکین/شاہ محبب اللہ چشتی بخاری/فارسی :

مکمل ، اوراق ۱۵۱ ، سطر فی صفحہ ۱۵ ، سائز "$9\frac{1}{2}'' \times 5$" ۔ تاریخ تصنیف ۱۲۰۷ھ ۔ تاریخ کتابت موجود نہیں ۔ ممکن ہے کہ اسی سال میں کتابت بھی ہو گئی ہو کیونکہ آخر میں لکھا ہے :

بہر استدعا مورخ در سن تاریخ گفت
مخزن سر الحقائق گشت تا ریخش چنیں ۱۲۰۷ھ

کاغذ دیسی ، مجلد ، عمدہ حالت ، خوشخط اوسط درجہ ۔

فقہ البراهنہ/نامعلوم/فارسی :

سائز : "$11'' \times 6\frac{1}{2}$" ۔ سطر فی صفحہ ۲۱ ۔ اوراق : ۱۸۳ ۔ کاغذ قدرے خستہ ۔ خط نستعلیق خوشخط ۔ کاتب کا نام اور تاریخ کتابت موجود نہیں ۔ اول موجود ، آخر ندارد ۔ موضوع : فقہ حنفی ۔ دو جلد یک جا ۔

قرآن حکیم :

از اول تا سورہ تکاثر ۔ خوشخط نسخ ۔ کاتب کا نام اور تاریخ کتابت موجود نہیں ۔ سائز "11 × "5½ ، سطر فی صفحہ ۱۱ ، غیر مطلا ۔ قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ بارھویں صدی ہجری کے اوائل کا ہے ۔

قرآن حکیم :

سورۂ برأت آیت ۹۶ سے آخر تک ۔ سورہ یونس تا آیت ۲۵ ۔ تاریخ کتابت ۱۲۸۵ھ ۔ کاتب کا نام موجود نہیں ۔ اوراق ۱۰ ۔ سطر فی صفحہ ۱۲ ۔ کاغذ براق ۔ سائز : "9 × "5½ خوشخط اعلیٰ ، مطلا ، عمدہ حالت ، جلد چرمی ۔

قرآن حکیم :

سورۂ عنکبوت از آیت ۶۴ تا آخر ۔ سورۂ روم مکمل ۔ سورۂ لقمان از اول تا آیت ۲۱ ۔ تاریخ کتابت ۱۲۸۵ھ ۔ اوراق ۱۱ ۔ سطر فی صفحہ ۱۲ ۔ سائز : "8¾ × "5½ ۔ کاغذ براق ۔ خوشخط اعلیٰ ۔ جلد چرمی ، مطلا ۔ عمدہ حالت ۔

قرآن حکیم :

سورۂ نحل از آیت ۸۴ تا آخر ۔ تاریخ کتابت ۱۲۸۵ھ ۔ اوراق ۹ ۔ سطر فی صفحہ ۱۲ ۔ کاتب کا نام موجود نہیں ۔ کاغذ براق ، مجلد ، عمدہ حالت خوشخط اعلیٰ ، جلد چرمی ۔ سائز : "9 × "5½ ۔

قرآن حکیم :

سورۂ نحل از آیت ۵۶ تا آخر سورۃ ، سورۂ قصص از اول تا آیت ۵۰ ، تاریخ کتابت ۱۲۸۵ھ ، کاتب کا نام موجود نہیں ، خوشخط اعلیٰ ۔ اوراق ۱۰ ، سطر فی صفحہ ۱۲ ، کاغذ براق ، مطلا ، مجلد ، چرمی جلد ، سائز "9 × "5½ ۔

قرآن حکیم :

فقط سورۂ یوسف ۔ خوشخط بہ خط اعلیٰ نسخ ۔ مطلا ، سورہ ہود از آیت ۸۲ تا آخر ۔ سورۂ یوسف از اول تا آیت ۵۲ ، سائز "8½ × "5½ ۔ سطر فی صفحہ ۱۲ ، اوراق ۹ ، حالت عمدہ ، کاغذ کاشانی ، مجلد ۔

قرآن حکیم :

سورۃ الاعراف از آیت ۱۷۱ تا آخر ۔ سورہ انفال شروع سے تا آیت ۴۰ ، کاتب : احمد ثانی ۔ کتابت : ۱۲۶۲ھ ۔ اوراق ۹ ۔ سائز "8 × "5 ۔ سطر فی صفحہ ۱۱ ، کاغذ عمدہ اصفہانی ۔ متن معہ ترجمہ فارسی ۔ مطلا ، خوشخط ، مجلد ، عمدہ حالت ۔

قرآن حکیم :

حائل شریف ۔ سائز $3\frac{1}{2}'' \times 2''$ ۔ سطر فی صفحہ ۱۹ ۔ کاتب : قاسم ابن حسین محمد آبادی ، اصفہان میں لکھی گئی ۔ تاریخ کتابت : ۱۲۳۷ھ ۔ کاغذ اصفہانی ، نہایت باریک مگر خوشخط ۔ مکمل ، جلد چرمی عمدہ ۔

قرآن حکیم :

شروع اور آخر کے کچھ صفحے کم ہیں ۔ خط بہار میں لکھا ہے ۔ خوشخط ، کاغذ خستہ ، مجلد ، حالت معمولی مگر محفوظ ۔ کتابت قرن نہم کی ہے کیوں کہ یہ خط اس کے بعد کالعدم ہوگیا ۔ سائز $9'' \times 6''$ ۔ سطر فی صفحہ ۱۷ ۔ یہ خط ۷۰ ، ۸۰ سال تک متداول رہا ۔

قرآن حکیم :

مکمل ، خوشخط ، مطلا ، تاریخ کتابت ۱۱۶۳ھ ، کاتب کا نام موجود نہیں ۔ سائز : $8'' \times 4\frac{1}{2}''$ سطر فی صفحہ ۱۳ ، مجلد ، کاغذ خستہ ، عمدہ حالت ۔

قرآن حکیم :

سائز : $11'' \times 6\frac{1}{2}''$ ۔ سطر فی صفحہ ۱۱ ، مکمل ، مجلد ، خط نسخ نہایت خوشخط استادانہ ، غیر مطلا ، تاریخ کتابت اور کاتب کا نام دونوں موجود نہیں ۔ پہلے ورق پر یہ عبارت ہے : ''عبدالخالق بن اخوند رفیق غازی المرغزی و ملا شکر خان ۔ قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ کتابت گیارھویں صدی ہجری کی ہے ۔ جلد اصلی مطلا ۔

قرآن حکیم :

مکمل ، مطلا ، محشہ ۔ کاغذ خراسانی ۔ عربی نسخ خوشخط ۔ عمدہ حالت ، مجلد ، کاتب : حافظ فخرالدین قادری ۔ سائز : $8\frac{1}{2}'' \times 5''$ ۔ سطر فی صفحہ ۱۱ ۔ حاشیوں پر عربی میں قرأت کے قرائن لکھے ہیں ۔ یہ ایک عجیب وصف ہے ۔ قرأت کے ساتوں انداز جگہ جگہ بیان کیے گئے ہیں ۔

قرآن کریم :

قرآن کریم کا اُردو ترجمہ از سورہ ق تا سورہ والناس ۔ سائز : $10\frac{1}{2}'' \times 6\frac{1}{2}''$ اوراق ۲۱۳ سطر فی صفحہ ۱۵ ۔ خوشخط ۔ تاریخ کتابت : ۲۲ محرم ۱۲۵۵ھ یہ غالباً اوائل کے ترجموں میں سے ہے ۔ شاہ عبدالقادر کے ترجمے سے مختلف ہے ۔ شاہ عبدالقادر کا ترجمہ ۱۲۰۵ھ میں ہوا لیکن اس ترجمے کی زبان اُس سے قدیم معلوم ہوتی ہے ۔ کاتب کا نام درج نہیں ۔ حالت عمدہ ، مجلد ۔

قصہ سسی پنوں/پیر فقیر حسن/پنجابی :

۱۴ اوراق ، مرمت شدہ ۔ سائز : $12'' \times 6''$ ۔ سطر فی صفحہ ۱۳ ۔ کاغذ لاہوری خستہ ۔ مجلد ۔

کمال الدین و تمام النعمۃ فی اثبات الغیبۃ و کشف الجریہ/عربی

مصنف : ابو جعفر محمد بن علی بن الحسین بن موسیٰ بن بابویہ القمی ، کاتب : محمد بن وفادار علی شعائر التبریزی ۔ تاریخ کتابت : ۱۰۵۰ھ خوشخط ، نسخ ، مکمل ، سائز : $12'' \times 7\frac{1}{2}''$ ، سطر فی صفحہ ۲۶ ، کاغذ موٹا ، عمدہ حالت ، غیر مطلا ۔

کنزالسالکین/خواجہ عبداللہ انصاری/فارسی :

اوراق ۳۱۴ ، جزو ۸۹ ۔ سائز $9'' \times 5''$ ۔ سطر فی صفحہ ۹ ۔ حاشیوں پر بھی لکھا ہے ، حاشیوں پر سطروں کا شمار ۲۲ ہے ۔ جگہ جگہ سرخ سیاہی سے عنوان باندھے گئے ہیں ۔ سرورق پر محبوب سبحانی کے کتب خانے کی مہر ثبت ہے ۔ خط نہایت اعلیٰ نستعلیق ۔ کتاب مرمت شدہ و مجلد ۔ عمدہ حالت ۔ ورق ۲۹۶ کے بعد مناجات درج ہیں جو ایران میں چھپ چکی ہیں ۔ اصل کتاب جہاں تک معلوم ہو سکا ہے ، غیر مطبوعہ ہے ۔

گلزار حال/بشن داس بھٹ/فارسی :

اصل کتاب سنسکرت میں ہے اور اس کا نام جے ہر بودہ چنداورے ہے ۔ مترجم سوامی بنوالی داس ولی فارسی کا ادیب اور صوفی منش تھا ، اپنے آپ کو دارا شکوہی لکھتا تھا ۔ اوراق ۱۱۶ ، سطر فی صفحہ ۱۳ ، سائز : $4\frac{3}{4}'' \times 3''$ کاغذ لاہوری ، خط نستعلیق معمولی اوسط درجہ ۔ تاریخ تصنیف ۱۰۱۳ھ ۔ مجلد ، عمدہ حالت ۔

مثنوی مولانا روم :

اول و آخر ناپید و ناقص ، کاغذ خستہ ، مطلا ، پانچویں دفتر تک ، تاریخ کتابت : ۱۱۵۷ھ ۔ کاتب کا نام موجود نہیں ۔ سائز : $13'' \times 7''$ ۔

مثنوی مولانا روم :

مکمل معہ مقدمہ و شرح فہرست کتاب ، مقدمہ لکھے جانے کی تاریخ ۱۰۳۲ھ مطلا ، یہ مثنوی تقریباً ۹ مستند نسخوں سے مقابلہ کرکے تیار کی گئی ہے ۔ اس کے فقط چند نسخے لکھے گئے تھے جن میں سے ایک یہ ہے : ''پروفیسر نکلسن نے مطبوعہ نسخے میں اس کا ذکر کیا ہے''۔ مقدمہ کے اختتام پر اس کے لکھے جانے کی تاریخ یوں نکالی ہے : انصرام یافتہ دیباچہ لطیف ، شرح و دیباچہ از علامہ عبداللطیف ، تاریخ کتابت یوں درج ہے : بست و یکم سال جلوس عالمگیری جو ۱۰۸۸ھ کے برابر ہے ۔ کاتب کا نام : شیخ محمد رفیع ۔

مجالس المومنین/قاضی نوراللہ شوستری/فارسی :

جزو ثانی ، اصلی جلد معہ نقش و نگار رنگین اندر و باہر ، مکمل ، بہ خط نسخ ، کتابت کی تاریخ ۱۰۳۹ھ - کاتب : محمد قاسم شیرازی سائز : $10\frac{1}{2}'' \times 6''$ - سطر فی صفحہ ۲۳ ، مطلا ، کاغذ قمی -

مجموعہ قوانین طب/حکیم سید اشرف علی :

مکمل - سائز $14'' \times 7''$ - سطر فی صفحہ ۱۹ - اوراق ۱۴۴ - خط نستعلیق اوسط درجہ خوشخط ، عمدہ حالت ، کاغذ لاہوری ، تاریخ و کاتب کا نام موجود نہیں -

مختصر شرح وقایہ/عربی :

مکمل ، سائز : $10'' \times 6''$ ، سطر فی صفحہ ۱۹ ، تاریخ کتابت ۱۰۲۳ھ کاغذ لاہوری ، قدرے خستہ ، عمدہ حالت ، مجلد ، خط نسخ خوشخط ، یہ کتاب محمد شاہ بن شاہ الحسین کی ملکیت رہ چکی ہے -

مصباح الہدایہ مفتاح الکفایہ/عزالدین محمود بن علی کاشانی/فارسی :

یہ ایک نادر نسخہ ہے ، علامہ جلال ہمائی استاد بزرگوار ایران نے اسے چند سال ہوئے ایران سے ایڈٹ کرکے شائع کیا ہے اور اسی نسخہ سے مدد لی ہے - ان کے خود اپنے ہاتھ کے کچھ نوٹس اس نسخے کے سرورق پر لکھے ہیں جو درج ذیل ہیں :

بسم سبحانہ و تقدست کمالہ - مولف این کتاب عزالدین محمود بن علی کاشانی است کہ در نفحات الانس جامی ترجمہ حال مختصرے ازوے نگاشتہ شدہ است بطورے کہ از نوشتہ جامی بدست می آید - عزالدین محمود معاصر بودہ است باکمال الدین عبدالرزاق کاشانی و این ہر دو مرید شیخ عبدالصمد اصفہانی بودہ اند و شیخ نور الدین عبدالصمد بیک واسطہ نسب ارادتش بہ شیخ شہاب الدین سہروردی [متوفی ۶۳۲ھ] مولف کتاب عوارف المعارف می پیوستہ است و این شیخ شہاب الدین غیراز شہاب الدین سہروردی معروف شیخ اشراق صاحب حکمتہ الاشراق و مؤلفات دیگر می باشد کہ در سال ۵۸۷ھ در حلب کشتہ شد . . . . کمال الدین عبدالرزاق کاشانی مؤلف شرح فصوص الحکم و شرح منازل السائرین و بعض مؤلفات دیگر است کہ در سال ۷۳۶ھ وفات یافتہ - پس مولف این کتاب از عرفائے قرن ہشتم ہجری بشمار میرود و این نسخہ نیز بحسب قرائن در ہمان قرن نوشتہ شدہ است و نام کتاب چونکہ در دیباچہ می نوسید ''مصباح الہدایہ و مفتاح الکفایہ'' است - جامی و صاحب طرایق الحقائق عزالدین محمود را مترجم کتاب عوارف می نویسد و این معنی علی الظاہر اشتباہ است ، زیرا خود مولف را

مقدمہ می نویسد کہ داستان ترجمہ عوارف خواستند و من تالیف مشغلے پرداختم— جلال ہمائی'' ۔

اس تحریر کو عیناً درج کر دیا گیا ہے کہ موجب استفادہ عام ہو ۔ یہ ایک عالم دین کے تاثرات ہیں اور غیر مطبوعہ ہیں ، پھر ایک اور ورق پر یوں حاشیہ ہمائی کی ہے :

بسم سبحانہ تاریخ کتابت این نسخہ از روئے قرائن رسم الخط و کاغذ و طرز کتابت و دیگر قرائن متعلق است بقرن ہشتم ہجری ۔ جلال ہمائی ۔

سائز $7'' \times 5''$ کاغذ کاشانی ۔ سطر فی صفحہ ۱۸ ۔ عنوانات قرمزی ۔ خط نستعلیق بقدرے وضع نسخ ، مجلد ، جلد چرمی ، حالت عمدہ ، البتہ قدرے خستہ ۔

مفتاح الفلاح/بہاء الدین آملی/عربی :

مکمل ، نسخہ خوش خط ، سائز $7\frac{1}{2}'' \times 4\frac{1}{2}''$ ۔ سطر فی صفحہ ۱۲ ، تاریخ کتابت : ۱۰۲۵ھ مقام کتابت : گنجہ ، کاغذ مومی ، مجلد محشی ، غیر مطبوعہ ۔

مالک کتاب کا نام یوں لکھا ہے : مالک العبدالاثم ابن محمد علی ابن سلطان محمود القاینی محمد مہدی ۔ اس کے کتب خانے کی مہریں بھی ثبت ہیں ۔ قیمت ''ہشت ہزار دینار'' لکھی ہے ۔

مکتوبات بابا افضل/بابا افضل کاشانی/فارسی :

کاتب : محمد مسعود ، تاریخ کتابت موجود نہیں ، مکمل ، فارسی نستعلیق ، سطریں ترچھی ، سطر فی صفحہ ۲۲ ، سائز : $6\frac{1}{2}'' \times 3\frac{1}{2}''$ عنوان سرخ سیاہی میں دیے ہوئے ہیں ۔ اوراق ۲۷ ، عمدہ حالت ، مجلد ، کاغذ باریک ۔

مکتوبات طاہر/فارسی :

مکمل ، خط معمولی ، قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ گیارہویں صدی ہجری کی تصنیف ہے ۔ اس میں بادشاہوں ، شاہزادوں اور امراء و وزراء کے نام خطوط ہیں ، ہر خط کا عنوان سرخی میں دیا گیا ہے ۔

اوراق ۹۶ ، سطر فی صفحہ ۱۶ ، سائز $10'' \times 6\frac{1}{2}''$ کاتب کا نام اور تاریخ کتابت موجود نہیں ۔ حالت عمدہ مجلد ۔

نل دمن/فیضی/فارسی :

مکمل ، خوشخط ، خط اوسط ، کاتب : شیخ احمد ، تاریخ کتابت : ۱۲۷۱ھ ۔ سائز $8\frac{3}{4}'' \times 4\frac{1}{2}''$ ، سطر فی صفحہ ۱۶ ، مجلد ، حالت عمدہ ، کاغذ لاہوری ۔

نل دمن/ابوالفیض فیضی/فارسی :

مکمل ، خوشخط ، کاغذ لاہوری ، کاتب : شیخ عمر بخش ، تاریخ کتابت : ۱۲۷۳ھ حاشیہ پر ملا نتھا کی شرح ، مجلد ، جلد ناقص ، حالت عمدہ ۔

تحریک شبان المسلمین

خواجہ عبدالوحید

بیسویں صدی کے ربیع اوّل میں اسلامیانِ ہند نے بڑی بڑی عظیم الشان تحریکیں چلائیں، جن کا تعلق براہِ راست برطانوی استعمار کے خلاف جدوجہد کرنے سے تھا۔ تحریک خلافت کے بعد مسلمانان ہند پر یاس و قنوطیت کا عالم چھا گیا۔ اس کے باوجود مختلف مقامات کے حسّاس مسلمانوں میں اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے جذبۂ عمل بیدار ہوا۔ ۱۹۳۵ء کے لگ بھگ مختلف طرح کے لوگوں میں احیاء اسلام کے لیے سوچ بچار شروع ہو گئی تھی۔ علی گڑھ میں ڈاکٹر سید ظفرالحسن صاحب صدر شعبہ فلسفہ، مسلم یونیورسٹی، مشرق پنجاب میں میر غلام بھیک نیرنگ جیسے لوگ اس موضوع پر سوچ بچار کر رہے تھے۔ اسی زمانہ میں لاہور کے چند نوجوان بھی اس طرف متوجہ ہوئے۔ ان سب لوگوں کے لیے اس سوچ بچار کے لیے مرکزی شخصیت ایک ہی تھی۔ یعنی علامہ سر محمد اقبال۔ چنانچہ ان میں سے ہر ایک علیحدہ علیحدہ ان سے زبانی یا تحریری طور پر تبادلہ خیالات کر رہا تھا۔

اوائل ۱۹۳۵ء میں جب علامہ اپنے مکان 'جاوید منزل' میں منتقل ہو چکے تھے، میں نے بھی میو روڈ کے دوسری طرف محلہ محمد نگر میں مکان بنا لیا تھا اور اس لیے آپ کے ہاں آنے جانے کی آسانی ہو گئی تھی۔ اسی زمانے سے یہ داستان شروع ہوتی ہے۔ میرا اپنا دستور یہ رہا ہے کہ میں حضرت علامہ کی خدمت میں دوپہر کے وقت یا خاصی رات گئے حاضر ہوا کرتا تھا تاکہ اور لوگ ان کے پاس موجود نہ ہوں اور ان سے اطمینان اور سکون سے گفتگو ہو اور جب میں گھر واپس آتا تو سب سے پہلے یہی کام کرتا کہ علامہ مرحوم کے ملفوظات کو من و عن اپنی ڈائری میں درج کرتا۔ اس میں طرح طرح کے دینی اور سیاسی مسائل پر ان کے خیالات ملتے ہیں لیکن موجودہ مضمون میں، میں صرف وہی باتیں درج کروں گا، جو ''جمیعۃ شبان المسلمین'' کی تجویز سے متعلق ہیں۔ اگر وقت نے ساتھ دیا تو انشاءاللہ کسی دوسرے موقع پر اور مسائل پر حضرت علامہ کے ارشادات عالیہ پیش کروں گا۔

۲۸ فروری ۱۹۳۵ء : کل رات صوفی صاحب[1] کے ہاں اس غرض سے مجلس مشاورت منعقد ہوئی کہ سر محمد اقبال کے تجویز کردہ نظام ''شبان المسلمین'' پر غور کیا جائے ۔ در اصل یہ سکیم جو ہمارے زیر غور ہے ۔ میر غلام بھیک نیرنگ اور ڈاکٹر ظفرالحسن کی تجویز کی ہوئی ہے[2] ۔ جس کا مقصد ''ہندوستان میں مسلمانوں کا عروج و اقبال'' ہے ۔ افسوس ہے کہ ان دونوں کی طرف سے آئے ہوئے کاغذات ڈاکٹر صاحب کے پاس ہیں اور وہ بھوپال گئے ہوئے ہیں ۔ اس لیے اس مسئلہ پر صحیح طور پر غور نہیں ہو سکتا ۔

۲۹ مارچ ۱۹۳۵ء : ۲۶ تاریخ کو صوفی صاحب کے ہاں اجتماع ہوا اور جمیعۃ شبان المسلمین ہند کے اصول اساسی کا مسودہ جو میں نے تیار کیا تھا زیر غور آیا اور بعد چند ترامیم منظور ہو گیا ۔

۵ اپریل ۱۹۳۵ء : کل حسب الارشاد علامہ سر محمد اقبال ایک مضمون مجوزہ ''جمیعۃ شبان المسلمین'' تیار کیا[3] اور دفتر جاتے ہوئے حضرت علامہ کو دکھایا ۔ انھوں نے پسند فرمایا ۔ دفتر میں مسٹر محمد افضل بھٹی سے اس مضمون کی چار نقلیں کرائیں ۔ اب ان پر لوگوں کے دستخط کرائے جائیں گے ، پھر دستخط کرنے والوں کا اجلاس ہوگا ، جس میں جمیعۃ کا رسمی طور پر قیام اور امیر کا انتخاب ہوگا اور اس کے بعد اس قیام و انتخاب کا اعلان کیا جائے گا ۔

۱- مراد صوفی غلام مصطفیٰ تبسم ایم ۔ اے سے ہے جو تیس پینتیس برس ایسے معاملات میں میرے شریک کار رہے اور جن کے ہاں اکثر اس قسم کے اجتماعات منعقد ہوا کرتے تھے ، وہ اس زمانہ میں مزار ''داتا گنج بخش'' کے عقب میں رہا کرتے تھے ۔

۲- جس زمانہ میں میرے احباب کی توجہ اس طرف ہوئی تھی ہم میں سے کوئی بھی اس حقیقت سے واقف نہ تھا ۔ جب پہلی مرتبہ علامہ مرحوم سے اس بارہ میں گفتگو ہوئی تو انھوں نے فرمایا کہ میر غلام بھیک نیرنگ اور ڈاکٹر سید ظفرالحسن صاحب بھی ان خطوط پر سوچ رہے ہیں اور انھوں نے اپنے خیالات تحریر میں پیش بھی کیے ہیں ۔ آپ لوگ ان سے خط و کتابت کرکے ان دونوں کی تجاویز حاصل کریں ۔ چنانچہ میں نے دونوں بزرگوں سے خط و کتابت شروع کر دی ، جس کا کچھ ذکر آئندہ اوراق میں آئے گا ۔

۳- افسوس ہے کہ اس مضمون کی نقل مجھے تاحال اپنے کاغذات میں نہیں ملی میرے پرانے کاغذات مختلف جگہوں پر محفوظ پڑے ہیں بہت ممکن ہے کہ وہ فائل جس میں ، میں نے اس تجویز کے متعلق جملہ کاغذات رکھے تھے کبھی مل جائے ۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ اس زمانہ کی میری ذاتی ڈائری محفوظ رہی ، جس سے یہ معاملہ موجودہ نسل کے سامنے آ سکا ہے ۔

۱۲ اپریل ۱۹۳۵ء : گذشتہ رات صوفی صاحب کی طرف گیا جہاں خود صوفی صاحب اور شیخ حسام الدین صاحب[1] سے مجوزہ جمیعت شبان المسلمین کے متعلق تبادلۂ خیالات ہوتا رہا ۔

۲۸ اپریل ۱۹۳۵ء : آج شام جب سید صاحب[2] کے ہاں سے اپنے گھر آ رہا تھا تو علامہ سر محمد اقبال کے مکان کے عین سامنے ان کا ملازم علی بخش ملا ، جس سے معلوم ہوا کہ باہر سے دو اصحاب ڈاکٹر صاحب کے پاس آئے تھے اور میرا پتہ دریافت فرما کر میری تلاش میں میرے دفتر[3] کی طرف چلے گئے تھے ۔ جب گھر پہنچا تو ایک لفافہ ملا ۔ جس میں ایک رقعہ خود حضرت علامہ[4] کے ہاتھ کا

۱۔ شیخ حسام الدین صاحب مجلس احرار کے بزرگ ترین راہنماؤں میں سے ہیں ۔ امرتسر کے رہنے والے ہیں جو صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کا بھی وطن مالوف تھا ۔ اب دونوں صاحبان لاہور میں مستقل طور پر مقیم ہیں ۔ احرار کے اول درجہ کے راہنماؤں میں اب صرف شیخ صاحب ہی بقید حیات ہیں ۔

۲۔ سید صاحب سے مراد ڈاکٹر سید محمد عبداللہ صاحب ایم ۔ اے (عربی) ایم ۔ اے (فارسی) ڈی لٹ ہیں جو پنجاب یونیورسٹی کے اورینٹل کالج کے پرنسپل ہو کر ریٹائر ہوئے ۔ اور اب یونیورسٹی کے شعبہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام (اردو) کے سربراہ ہیں ۔ سید صاحب میرے ان احباب خاص میں سے ہیں جن کے ساتھ مل کر میں نے ایک ربع صدی تک بے شمار دینی ، سیاسی اور علمی کاموں میں حصہ لیا ۔ ۱۹۲۸ء میں جب لاہور میں اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا قیام عمل میں آیا تو وہ پیش پیش تھے ۔ بلکہ اگر ان کو اس کا محرک اوّل قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا ۔ اس انسٹی ٹیوٹ نے کم و بیش بیس برس کام کیا اور جب قیام پاکستان کے بعد میں نے لاہور چھوڑا تو اس کا کام ختم ہو گیا ۔

۳۔ دفتر سے مراد اکونٹنٹ جنرل پنجاب کا دفتر ہے جس میں میں نے اکتوبر ۱۹۲۳ء سے ۱۹۴۷ء تک ملازمت کی ۔

۴۔ اس رقعہ کا مضمون حسب ذیل تھا ۔

My dear Khawja Wahid,

These gentlemen came from Aligarh to talk about the matter about which you wrote to Sayyid Zafar Hasan of Aligarh. Perhaps you and your friends would like to have a talk with them. If so please come to my place any time in the evening. You can bring your friends who are in sympathy with you.

Yours,
Mohammad Iqbal.

مائی ڈیر خواجہ وحید !

یہ صاحبان علی گڑھ سے اس امر کے متعلق گفتگو کرنے آئے ہیں جس کے بارے میں آپ نے علی گڑھ کے سید ظفر حسن کو لکھا تھا ۔

لکھا ہوا تھا ۔ اور دوسرا ان نو وارد حضرات کا جس سے معلوم ہوا کہ علی گڑھ سے ڈاکٹر سید ظفرالحسن صاحب نے دو صاحبوں کو لاہور اس غرض سے بھیجا ہے کہ وہ ہم لوگوں سے مجوزہ جمعیت شبان المسلمین کے متعلق تفصیلی طور پر تبادلۂ خیالات کریں ان صاحبوں نے لکھا تھا کہ مغرب کے وقت میں مع اپنے دوستوں کے ڈاکٹر صاحب کے مکان پر[1] ان سے ملاقات کروں ۔

میں جس وقت گھر پہنچا ، دو بجے علیل تھے ۔ میں نے ملازم کو سائیکل دے کر بھیجا تا کہ وہ ڈاکٹر عبدالغنی صاحب[2] کو بلا لائے ، لیکن انھیں آنے میں دیر ہو گئی ۔ ادہر مغرب کا وقت ہو گیا ۔ میں بہت پریشان ہوا کہ نہ ڈاکٹر صاحب آئے اور نہ ہی میں ان لوگوں تک پہنچ سکا ۔ بالآخر دیر تک انتظار کرنے کے بعد میں سر محمد اقبال کی طرف روانہ ہو گیا ۔ وہاں علی گڑھ کے احباب[3] کے علاوہ حسرت صاحب[4] بھی بیٹھے تھے ۔ موخرالذکر تو جلد اٹھ کر چلے گئے

غالباً آپ اور آپ کے دوست ان سے گفتگو کرنا پسند کریں گے ، اگر یہ خیال صحیح ہے تو آپ شام کو کسی وقت بھی میرے ہاں آ جائیں ۔ آپ اپنے ان دوستوں کو بھی ہمراہ لا سکتے ہیں ، جو آپ کے ہم خیال ہیں ۔ آپ کا محمد اقبال

۱۔ جاوید منزل ۔

۲۔ ڈاکٹر عبدالغنی ایم ۔ بی ۔ بی ۔ ایس مرحوم میرے بڑے اچھے دوستوں میں سے تھے اور میرے قریب ہی رہتے تھے ۔ البتہ ان کا مطب فلیمنگ روڈ پر تھا جو جگہ میرے گھر سے خاصی دور تھی ۔

۳۔ علی گڑھ سے آنے والے یہ صاحبان تھے : (۱) ڈاکٹر ایم ۔ ایم احمد صاحب اور (۲) ڈاکٹر برہان احمد فاروق اول‌الذکر اس زمانہ میں علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبہ فلسفہ میں استاد تھے ۔ اور فاروق صاحب طالب علم ، سید ظفرالحسن صاحب نے اپنے خط میں ان دونوں کو اپناشا گرد لکھا تھا ۔ ڈاکٹر احمد صاحب اب کراچی یونیورسٹی کے شعبہ فلسفہ کے ہیڈ ہیں ۔ ڈاکٹر فاروق صاحب قیام پاکستان کے بعد ایم ۔ اے ۔ او ۔ کالج لاہور میں کئی برس تک لیکچرر رہے ۔ بعد میں کراچی آ گئے اور کم و بیش ایک سال تک اسلامک سنٹر نارتھ ناظم آباد میں کام کرتے رہے پھر غالباً یہاں کے ''اسلامیہ کالج'' سے منسلک ہو گئے تھے ۔ ان کے موجودہ مشاغل سے میں واقف نہیں ہوں ۔

۴۔ مراد مولانا چراغ حسن حسرت ہے جو مدتوں مولانا ظفر علی خاں کے ساتھ رہ کر صحافت کا بہت وسیع تجربہ حاصل کر چکے تھے اور اردو زبان کے بہترین مزاح نگار تھے ۔ مدتوں لاہور سے ایک ہفتہ وار پرچہ ''شیرازہ'' نکالتے رہے ، جس نے مزاح نگاری کا بہت اونچا معیار قائم کر دیا ۔ میرے بڑے کرم فرما تھے اور انھوں نے میرے مشاغل میں ہمیشہ میرے ساتھ تعاون کیا ۔

اور ہم لوگ گفتگو کرنے لگے ۔ رات کے ساڑھے نو بجے تک بہت سی باتیں ہوئیں اور پھر طے پایا کہ وہ دونوں صاحبان اگلے روز تین بجے (سہ پہر) میرے مکان[1] پر آئیں اور میرے دوستوں سے تبادلۂ خیالات کریں ، جس کے بعد ہم سب لوگ حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوں ۔ ساڑھے نو بجے رات وہ لوگ اٹھے اور میں ان کے ساتھ میکلوڈ روڈ پر ''میڈیکل کالج'' کے ہوسٹل تک گیا ۔

۲۵ مئی ۱۹۳۵ع : نماز جمعہ سے فارغ ہو کر انٹر کالجیٹ مسلم برادر ہڈ کے ارکان کے ساتھ مجوزہ ''جمیعت شبان المسلمین'' کے متعلق گفتگو کی اور ان میں سے چار حضرات کے دستخط حاصل کیے ۔

۳۰ مئی ۱۹۳۵ع : کل ۵ بجے کے بعد پروفیسر منیرالدین صاحب[2] تشریف لائے ۔ میں نے ان کو اور راجہ حسن اختر صاحب[3] کو مجوزہ ''جمعیتہ شبان المسلمین'' کے متعلق مشورہ کرنے کے لیے بلایا تھا ، لیکن چونکہ مؤخرالذکر تشریف نہ لائے اس لیے پروفیسر صاحب سے اسلامیہ کالج کے متعلق گفتگو ہوتی رہی ۔ ۷ بجے وہ تشریف لے گئے اور میں بھی گھر سے باہر نکلا ۔ رات واپسی پر معلوم ہوا کہ راجہ صاحب میرے جانے کے بعد میرے ہاں تشریف لائے تھے ۔ اور ان کے ہمراہ کوئی اور صاحب بھی تھے ۔

۲۱ اگست ۱۹۳۵ع : آج ہمارے[4] ہاں مجوزہ جمعیت شبان المسلمین کے ہمدردوں کا جلسہ ہوا جس میں جمعیت کی بنیاد رکھ دی گئی ۔ نیز ارکان نے تحریری طور پر اطاعتِ امیر کا عہد کیا[5] اور جمعیت کی امارت کے لیے علامہ

۱۔ میرا مکان ''قدیر منزل'' ''جاوید منزل'' کے بالمقابل میو روڈ کے دوسری طرف قریباً ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر تھا ۔ یوں حضرت علامہ مرحوم کے ملنے والوں میں غالباً سب سے زیادہ ان کے قریب رہتا تھا ۔

۲۔ پروفیسر منیرالدین ایم ۔ ایس ۔ سی اسلامیہ کالج لاہور میں کیمسٹری کے پروفیسر تھے اور احیاءاسلام کی تحریکوں میں بہت دلچسپی رکھتے تھے ۔

۳۔ راجہ حسن اختر صاحب پی ۔ سی ۔ ایس تھے ۔ بڑے اچھے اسلامی خیالات رکھتے تھے اور عمر بھر بڑے اچھے مشاغل میں مصروف رہے ۔ آخر عمر میں سرکاری ملازمت سے الگ ہو کر سیاست میں مصروف ہو گئے تھے ۔ وفات سے کچھ عرصہ پہلے اقبال اکیڈمی کی گورننگ کونسل کے رکن نامزد ہو گئے تھے اور کبھی کبھی اس کی کارروائی میں حصہ لینے کے لیے کراچی آتے رہتے تھے ۔ یہیں میری ان سے آخری ملاقات ہوئی تھی ۔

۴۔ یعنی میرے مکان ''قدیر منزل'' پر ۔

۵۔ اس غرض کے لیے جو عہد نامہ طبع کرایا گیا تھا ، اس کا ذکر آگے آتا ہے ۔ دیکھیے نوٹ نمبر ۱ صفحہ ۸۹ پر ۔

سر محمد اقبال کا اسم گرامی تجویز ہوا ۔ پروویژنل سیکرٹری کا کام ثاقب صاحب[۱] کے سپرد ہوا اور خزانچی بدر صاحب[۲] مقرر ہوئے ۔

آج ہمارے ہاں کا اجلاس بہت کامیاب رہا ، غیرمعمولی رونق تھی ، نذیر نیازی صاحب[۳] نے گفتگو کو بہت پر لطف بنا دیا ۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر عبدالغنی بھٹی ، ڈاکٹر عبدالحمید ملک[۴] ، ثاقب صاحب ، افضل صاحب ، بدر صاحب ، طارق صاحب[۵] ، ابوالخیر صاحب[۶] ، بٹی صاحب[۷] ، خواجہ غلام دستگیر صاحب[۸] ، ارمان صاحب[۹] بھی تھے ۔

۱۔ یعنی نجم الثاقب جو اس زمانہ میں ''کنگ ایڈورڈ میڈیکل'' کالج لاہور کے طالب علم تھے ۔ میرے بڑے مستعد اور مخلص شریک کار تھے ۔ جنگ عظیم میں غالباً برما کے محاذ پر راہی ملک بقا ہو گئے تھے ۔ مرحوم پنجاب کی مشہور ماہر تعلیم محترمہ خدیجہ بیگم صاحبہ کے چھوٹے بھائی تھے ۔

۲۔ بدرالدین بدر صاحب ایک مخلص نوجوان تھے اور اس زمانہ میں رہن پریس ، لاہور میں کام کرتے تھے ۔

۳۔ سید نذیر نیازی صاحب حلقۂ اقبال کے مشہور و معروف رکن ہیں ، جو اب تک اقبال پر بہت کچھ لکھ چکے ہیں ۔

۴۔ ڈاکٹر عبدالحمید ملک میو ہسپتال کے مشہور ڈاکٹر ہیں ۔ ان کی تمام عمر خدمت دین و ملت میں صرف ہوئی ہے ۔ انتہا درجہ کے صالح اور مخیّر مسلمان ہیں ۔ میرے ساتھ ہر نیک کام میں انھوں نے اشتراک عمل کیا ہے ۔

۵۔ مراد عبدالرشید طارق صاحب سے ہے جو اس زمانہ میں طالب علم تھے اور ایم ۔ اے ہونے کے بعد سلسلۂ ملازمت میں منسلک ہوئے ۔ قیام پاکستان کے بعد وہ حکومت پاکستان کی وزارت معلومات میں آفیسر ہو گئے تھے ۔

۶۔ مراد مولانا ابوالخیر عبداللہ ایم ۔ اے سے ہے جو اب اسلامیہ کالج لاہور سول لائن میں لیکچرار ہیں ۔

۷۔ مراد مسٹر محمد شریف بٹی بی ۔ اے ۔ ایل ۔ ایل ۔ بی سے ہے جو ہمیشہ علمی اور تاریخی مسائل میں دلچسپی لیتے رہے ہیں اور آج کل بٹی قوم کی تاریخ مرتب کرنے میں منہمک ہیں ۔

۸۔ خواجہ غلام دستگیر صاحب دفتر اکوئنٹ جنرل میں اسسٹنٹ اکاؤنٹس آفیسر کے عہدہ سے ریٹائر ہو کر ''انجمن حمایت اسلام'' کے دفتر میں آنریری فنانشل سیکرٹری ہو گئے تھے ۔

۹۔ مراد مولوی خدا بخش صاحب سے ہے جو اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ دروازہ میں اورینٹل ٹیچر تھے ۔ وہ اس زمانہ میں بچوں کا ایک ہفتہ وار اخبار 'نونہال' بھی ایڈٹ کرتے تھے اور گاہے گاہے قومی اور اخلاق نظمیں کہتے تھے جن میں ارمان تخلص استعمال کیا کرتے تھے ۔ عمر بھر دین و وطن کی خدمت میں ہر

۲۲ اگست ۱۹۳۵ء : علامہ سر محمد اقبال کے دل میں اسلام کا جو درد موجود ہے اور اسلام کو دنیا میں با اقبال و سربلند دیکھنے کا جو جذبہ ان کے قلب میں موجزن ہے اس کے بروئے کار آنے کی شدید ضرورت ہے اور اس کی صورت یہی ہے کہ ان کے گرد فدائیوں کا ایک ایسا گروہ جمع کر دیا جائے جو صدق دل کے ساتھ اپنے آپ کو ان کے سپرد کر دینے پر آمادہ ہو ۔ اس صورت میں ایک طرف خود حضرت علامہ کے دل و دماغ میں ایک ایسی حرکت پیدا ہوگی جو قوم سے کام لے سکے گی اور دوسری طرف وہ جماعت آپ سے وابستہ ہو چکی ہوگی جس میں زبردست قوت عمل بروئے کار آئے گی ۔ خدا کرے کہ میرا یہ خواب سچا ثابت ہو اور نوجوانان اسلام کثیر تعداد میں ایک فعال جماعت کی صورت میں منظم ہو جائیں ۔ اگر اس بارے میں میری کوششیں کامیاب ہو جائیں تو یہ میرے لیے بڑی ہی خوش نصیبی کا باعث ہوگا ۔

یکم ستمبر ۱۹۳۵ء : آج ''جمعیۃ شبان المسلمین'' کا اجلاس میرے مکان پر ہوا اور رکنیت کے مطبوعہ فارم[۱] حاضرین میں تقسیم ہوئے ۔ قرار پایا کہ کل ایک وفد حضرت علامہ کی خدمت میں پیش ہو کر اس جماعت کی طرف سے چند معروضات پیش کرے اور کوشش کی جائے کہ جلد از جلد کام شروع ہو جائے ۔ آج کے اجتماع میں راجہ حسن اختر صاحب بھی شریک ہوئے اور اجلاس کے اختتام کے بعد بھی وہ دیر تک بیٹھے رہے ۔

۲ ستمبر ۱۹۳۵ء : آج دفتر ''اسلام''[۲] کو جاتے ہوئے میں علامہ

چھوٹی بڑی تحریک میں حصہ لیتے رہے ۔ تحریک ہجرت سے لے کر تحریک جہاد کشمیر سبھی میں زبردست قربانیاں کرتے رہے ۔ اب ریٹائرڈ زندگی بسر کرتے ہیں ۔

۱۔ اس فارم کا مضمون حسب ذیل تھا :

(۱) ہندوستان میں مسلمانوں کے عروج و اقبال کے حصول کے لیے جو جماعت قائم کی گئی ہے ، میں اس کا رکن بننے کے لیے تیار ہوں اور اس بات کا عہد کرتا ہوں کہ امیر کی اطاعت قرآن و سنت کے مطابق بہرحال اور بروقت بلا چون و چرا کروں گا ۔

(۲) میں متمنی ہوں کہ اس جماعت کی امارت علامہ سر محمد اقبال مدظلہ کے دست مبارک میں ہو ۔

نام———— پتہ———— دستخط

۲۔ ''اسلام'' انجمن خدام الدین لاہور کا پندرہ روزہ انگریزی پرچہ تھا ، جو ۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۹ء تک بڑی باقاعدگی کے ساتھ نکلتا رہا ۔ اس کی ترتیب و ادارت کا کام تمام تر میرے سپرد تھا ۔ لیکن چونکہ اس میں انگریزوں کے خلاف

سر محمد اقبال سے ملا اور انھیں مطبوعہ فارم (رکنیت) دکھایا ۔ آپ نے فرمایا کہ یہ فارم ڈاکٹر سید ظفرالحسن صاحب کو علی گڑھ بھیجا جائے ۔

۳ ستمبر ۱۹۳۵ء : کل چھ بجے شام پانچ نوجوانوں کے ہمراہ سر محمد اقبال کی خدمت میں حاضر ہوا ۔ بعد میں تین اور دوست جن میں راجہ حسن اختر شامل تھے، آ گئے ۔ قریباً آٹھ بجے تک یہ اجتماع قائم رہا ۔ ڈاکٹر صاحب قبلہ نے دوران گفتگو علم و حکمت کے دریا بہا دیے ۔ الہام اور عقل ، تقدیر اور اہل نبوت اور تصوف ایسے بہت سے موضوع زیر بحث آئے ۔ کاش کہ ایسے مواقع پر ان کے تمام الفاظ نقل کر لیے جایا کریں ۔[۱]

۲۲ ستمبر ۱۹۳۵ء : ماہ ستمبر کے شروع میں جمعیۃ شبان المسلمین کے کام کی بنیاد رکھ دی گئی تھی اور ثاقب صاحب اس کے عارضی ناظم منتخب ہوئے تھے ، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک انھوں نے کوئی کارروائی نہیں کی ۔

شدید نکتہ چینی ہوتی تھی اور میں سرکاری ملازم تھا اس لیے بحیثیت مدیر مسئول اس پر نام خواجہ محمد رشید وائیں صاحب کا لکھا گیا تھا ۔ خواجہ صاحب موصوف لاہور کی مشہور آسٹریلیا فیملی کے سب سے بڑے رکن ہیں اور ہمیشہ دینی تحریکات میں پورے جوش و خروش کے ساتھ شریک ہوتے رہے ہیں - اخبار 'اسلام' جنگ عظیم ثانی کے شروع ہی میں بند کر دیا گیا تھا ۔ اس کا قصہ یوں ہے کہ میں نے اخبار کے صفحہ اول پر ایک مضمون ''ممالک مشرق میں مغربی حکومتوں کے مظالم'' کے عنوان سے لکھا جس میں مختلف انگریزی کتابوں کے اقتباسات جمع کر دیے گئے تھے اور اپنی طرف سے کوئی اظہار رائے نہ کیا گیا تھا ۔ سب کتابیں جن کے اقتباسات جمع کیے گئے تھے عام طور بازار اور لائبریوں میں موجود تھیں ۔ لیکن اس کے باوجود حکومت پنجاب نے اخبار سے پانچ سو روپیہ کی ضمانت طلب کر لی ۔ انجمن نے ہائی کورٹ میں اس حکم کے خلاف اپیل کی لیکن وہ چیف جسٹس نے رد کر دی ۔ اس پر انجمن نے اخبار بند کر دیا اس لیے کہ اگر ضمانت داخل کی جاتی تو اس کے ضبط ہو جانے کا احتمال تھا ۔ اس مقدمہ میں انجمن کی طرف سے مرحوم ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین صاحب نے ، جو اپنے آخری دنوں میں پنجاب کی مجلس مقننہ کے اسپیکر تھے ، پیروی کی تھی ۔

''اسلام'' ہی وہ پرچہ تھا جس میں علامہ مرحوم کا معرکہ آرا انگریزی مضمون ''اسلام اور احمد ازم'' پہلی مرتبہ شائع ہوا تھا ۔ علامہ مرحوم کے کئی اور بیانات بھی اس پرچہ میں شائع ہوئے تھے اور اس کے شذرات میں اکثر ان کے مشورے ہی سے لکھا کرتا تھا ۔ آپ اس پرچہ کا التزام کے ساتھ مطالعہ فرمایا کرتے تھے ، جو میرے ایسے ہیچمدان کے لیے بہت ہی ہمت افزائی کا موجب تھا ۔

۱۔ میں اگرچہ حضرت علامہ کے ملفوظات گھر جا کر ضبط کر لیا کرتا تھا لیکن تعجب ہے کہ اس تاریخ کے ارشادات محفوظ نہیں ۔

۱۴ مارچ ۱۹۳۶ء : آج میرے مکان پر معتقدین اقبال کا اجتماع ہوا جس میں راجہ حسن اختر صاحب اور پروفیسر منیرالدین صاحب کے علاوہ ثاقب صاحب، بٹی صاحب، ابوالخیر صاحب، ڈاکٹر بھٹی صاحب بھی شریک ہوئے اور ظاہر ہوا کہ لوگ اصل تجویز دربارہ ''جمعیہ شبان المسلمین'' پر عمل پیرا ہونے کے لیے تیار نہیں، وہ سب محض اس بات کے حامی تھے کہ ایک دارالمطالعہ قائم کیا جائے جہاں اقبال کی کتابوں کا مطالعہ اور ان کی تعلیمات کی نشر و اشاعت ہوا کرے۔ چناں چہ اس پر اجلاس ختم ہو گیا۔[۱]

ایک بڑی ہی خوش آیند تحریک کایہ المناک انجام ہم لوگوں کے کمزور ارادوں کا ثبوت پیش کرتا ہے۔

اس کے بعد ۱۹ مارچ ۱۹۳۶ء کو اٹھارہ انیس احباب کا اجتماع ایک دوست کے مکان پر ہوا اور ''بزم اقبال'' کا قیام عمل میں آیا۔ بزم کا مقصد ''اقبال'' کے کلام کا مطالعہ قرار پایا۔ اس میں میرا انتخاب بحیثیت معتمد عمل میں آیا اور صوفی تبسم صاحب اور سید نذیر نیازی مجلس منتظمہ کے ارکان مقرر ہوئے۔

۱۔ شاید ایسے ہی حالات میں کبھی حضرت علامہ نے یہ شعر کہا تھا:

دیا اقبال نے ہندی مسلمانوں کو سوز اپنا
یہ اک مرد تن آساں تھا تن آسانوں کے کام آیا

اقبال کی بعض یادیں

محمد شفیع (م ۔ ش)

مارچ ۱۹۳۶ء سے جب قائد اعظم مسلم لیگ کی تنظیم جدید کے سلسلہ میں پہلی مرتبہ لاہور تشریف لائے ، اواخر اپریل ۱۹۳۸ء تک جب حضرت علامہ اقبالؒ کا وصال ہوا ، مجھے پورے دو سال کم و پیش روزانہ ہی ''جاوید منزل'' میں حضرت علامہؒ کی خدمت میں حاضری کی سعادت حاصل رہی ۔ مرض الموت کے آخری ایام میں تو میں نے حضرت علامہ کے ارشاد کے مطابق ''جاوید منزل'' میں مستقل قیام اختیار کر لیا تھا ۔ ان دو سالوں میں میرے خود اختیار کردہ فرائض میں خط و کتابت میں حضرت علامہؒ کو مدد دینے کے علاوہ مٹھی چاپی میں علی بخش کا ہاتھ بٹانا بھی شامل تھا ۔ میرے ذہن کے کباڑ خانہ میں یادوں کا دفتر گڈ مڈ موجود ہے ، جنھیں کبھی فرصت کے اوقات میں ترتیب دینا میری زندگی کی آرزووں میں سر فہرست ہے ۔ ان میں سے چند یادوں کو ترتیب و تنظیم کے بغیر آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں :

۱۹۳۷ء میں گرمیوں کے دن تھے ۔ حضرت علامہؒ بنیان اور تہمد میں ملبوس اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھے حقہ سے شغل فرما رہے تھے ، علی بخش ان کے پاؤں دبا رہا تھا ۔ میں انھیں اخبارات سے خبریں سنا ہی چکا تھا کہ ڈاکٹر عبدالحمید ملک جو کہ آج کل 'کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج' لاہور میں معلم ہیں اور اُن دنوں انٹر کالجیئٹ مسلم برادر ہڈ کی روح و رواں تھے ، تشریف لائے ۔ علامہ اقبالؒ نے ان کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان کی خیریت دریافت کی پھر گفتگو کا ورد چلا ۔ دفعتہً ڈاکٹر عبدالحمید ملک نے سلسلہ کلام کا رخ پھیرتے ہوئے نہایت بے تکلفی سے حضرت علامہؒ سے پوچھا ''ڈاکٹر صاحب ! آپ حکیم الامتؒ کیسے بنے ؟ حضرت علامہؒ نے بلا توقف فرمایا ''یہ تو کوئی مشکل نہیں ، آپ چاہیں تو آپ بھی حکیم الامتؒ بن سکتے ہیں ۔'' ڈاکٹر ملک نے استعجاب سے پوچھا ''وہ کیسے؟'' حضرت علامہ نے فرمایا ''میں نے گن کر ایک کروڑ مرتبہ درود شریف کا ورد کیا ہے ، آپ بھی اس نسخہ پر عمل کریں تو آپ بھی حکیم الامتؒ بن سکتے ہیں ۔'' میں سوچتا ہوں کہ حساب کیا جائے تو ایک کروڑ مرتبہ درود شریف کا مسلسل ورد کرنے کے لیے چار سال ، نو ماہ اور چھ دن درکار ہیں ۔ حضرت علامہؒ کو جب بھی فراغت ملتی تھی تو وہ آقائے دو جہان سرور کائنات

رسول اللہ صلی علیہ و آلہ وسلم کی خدمت میں درود و صلٰوۃ کے تحائف بھیجتے تھے :

کافر ہندی ہوں میں دیکھ میرا ذوق و شوق
لب پہ صلٰوۃ و درود ، دل میں صلٰوۃ و سلام

انٹر کالجئیٹ مسلم برادرہڈ کا قیام ۱۹۳۱ء میں عمل میں آیا ۔ یہ تنظیم لاہور کے کالجوں کے دین پسند طلبہ پر مشتمل تھی ۔ پروگرام یہ ہوتا کہ اتوار کے اتوار اراکین ڈاکٹر ملک کے مکان پر اکٹھے ہوتے ، جہاں اسلامی موضوعات پر مقالے پڑھے جاتے ، کالجوں کے طلبہ کو غیر اسلامی اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے تدابیر پر غور کیا جاتا ۔ اس تنظیم نے ہزاروں کی تعداد میں انگریزی زبان میں اسلامی موضوعات پر پمفلٹ چھاپ کر مفت تقسیم کیے ۔ مفتی اعظم فلسطین نے جو پچھلے دنوں خوش قسمتی سے پاکستان میں ہمارے درمیان موجود تھے ، لاہور اسلامیہ کالج کے حبیبیہ ہال میں پہلی مرتبہ انٹر کالجئیٹ مسلم برادرہڈ ہی کے زیر اہتمام ایک ولولہ انگیز خطاب میں مسلمانوں کو فلسطین کے مسئلہ کی نزاکت سے آگاہ کیا تھا ۔ یہ فخر بھی برادرہڈ کو حاصل ہے کہ اس نے حضرت علامہ اقبالؒ کی زندگی میں اوّلین یوم اقبال منانے کی تحریک کی ۔ یہ تقریب ۱۹ مارچ ۱۹۳۸ء کو سارے ہندوستان میں نہایت جوش و خروش اور عقیدت و احترام سے منائی گئی ۔ اس موقع کے لیے برادرہڈ نے نہ صرف ہندوستان کے زعماء سے (قائد اعظم سمیت) بلکہ بیرون ملک علمی و ادبی حلقوں سے پیغامات حاصل کیے ، جن میں حضرت علامہؒ کو ان کی بیش بہا خدمات پر تحسین و تبریک کے پھول پیش کیے تھے ۔ کئی نامور افراد اور اداروں نے اس موقع پر حضرت علامہؒ کی خدمت میں تار ، خط اور نظمیں ارسال کیں ، جن میں ان کی درازی عمر کی دعائیں کی گئی تھیں ۔ اس وقت ایک اندازے کے مطابق ایک ہزار سے زائد مقامات پر یوم اقبالؒ کی تقریبات منعقد ہوئیں ۔ خود لاہور میں یوم اقبالؒ کی چار نشستیں منعقد ہوئیں جن میں مسلمان ، ہندو اور سکھ سبھی مقرروں نے حضرت علامہؒ کو خراج عقیدت پیش کیا ۔ ان تقریبات کے خاتمہ پر جب برادرہڈ کے اراکین کا ایک وفد حضرت علامہؒ کی خدمت میں اپنی عقیدت کے اظہار کے لیے حاضر ہوا تو آپ نے اظہار خوشنودی کے طور پر فرمایا ''آپ کی تحریک کی کامیابی کو دیکھ کر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے جس زمین کو خون جگر سے سینچا ، وہ شور ثابت نہیں ہوئی ۔'' اس کے ساتھ ہی انھوں نے فرمایا ''مجھے پورے ہندوستان کے نقشہ سے اپنے ربط کا اب پتہ چلا ہے ۔'' نیروبی (کینیا) سے ایک قرارداد جس میں حضرت علامہؒ کے علاوہ قائد اعظم اور اتاترک کی درازی عمر کی دعائیں کی گئی تھیں کا جواب دیتے ہوئے وہاں کے مسلمانوں کی انجمن کو یہ پیغام پہنچایا ''میں اپنا کام ختم کر چکا ہوں ۔ میرے بجائے اب

آپ صرف قائد اعظم اور اتاترک کی درازی عمر کے لیے دعا کریں ۔''

جب مارچ ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ کی تنظیم جدید کے خیال سے قائد اعظم لاہور رونق افروز ہوئے تو وہ حضرت علامہؒ سے بھی ملنے آئے ۔ یہ وہ دن تھے جب علامہ کی صحت غیر معمولی طور پر سقیم تھی ۔ طبّی اصطلاح کے مطابق وہ (Cardiac Asthma) کے مرض میں مبتلا تھے ۔ ان کی آواز بیٹھ گئی تھی ۔ چلنے پھرنے سے اگرچہ معذور نہیں تھے ، لیکن کیفیت یہ تھی کہ اپنے برادر نسبتی خواجہ عبدالغنی کی موت پر ان کے جنازے میں شرکت کے لیے میانی صاحب تک گئے اور شام کو جب تجہیز و تکفین سے فارغ ہو کر واپس ''جاوید منزل'' پہنچے ، تو ان کی حالت غیر تھی ۔ ان کی زندگی خواب گاہ سے ڈرائنگ روم تک اور ڈرائنگ روم سے صحن تک آمد و رفت کی شکل میں محدود ہو کر رہ گئی تھی ۔ فرماتے تھے کہ ''میں اپنی زندگی کا مشن پورا کر چکا ہوں ۔ اب مجھے زیادہ زندہ رہنے کی ہوس نہیں ۔''

جب قائد اعظم نے ان سے مسلم لیگ کی تنظیم جدید کے متعلق مشورہ کیا تو حضرت علامہ نے فرمایا ''میں آپ کے مشن کی کامیابی کے لیے اپنی رگوں کا آخری قطرۂ خون نچوڑ دوں گا ۔'' جس وقت حضرت علامہ اور قائد اعظم کے مابین یہ تاریخی ملاقات ہوئی ، حضرت علامہ حسب معمول قمیض اور تہبند میں ملبوس تھے ۔ وہ اپنے بستر میں گاؤ تکیہ سے ٹیک لگا کر لیٹے تھے ۔ قائد اعظم ان کے سامنے بید کی ایک کرسی پر فروکش تھے ۔ علامہ کی ارضی زندگی کا یہ آخری سال تھا ان دنوں ان کی ذہنی کیفیت دھوپ میں بیٹھے ہوئے یونان کے اس فلسفی سے مختلف نہ تھی ، جس نے سکندر اعظم کی اس عرضداشت پر کہ میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں ؟ ایک شان استغناء سے جواب دیا تھا ''آپ میرے لیے دھوپ چھوڑ دیں ۔''

ایسی جسمانی اور ذہنی کیفیت کے باوجود حضرت علامہ نے قائد اعظم کی حمایت کا نہ صرف زبانی وعدہ فرمایا ، بلکہ صوبہ مسلم لیگ کی صدارت ، جو اس دور کے سیاسی سیاق و سباق میں کانٹوں کے تاج کا درجہ رکھتی تھی ، بہ طیب خاطر قبول کی اور جب تک خان بہادر ملک زمان مہدی خان سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہو کر یونی نسٹوں سے مقابلہ کے لیے سیاست میں نہیں آ گئے ، اس منصب پر متمکن رہے ۔ ملک زمان مہدی خان کے صوبائی مسلم لیگ کا صدر منتخب ہونے کے بعد بھی حضرت علامہ نے قائداعظم کے ایک سپاہی کے بیج کی نشانی کے طور پر مسلم لیگ کی وائس پریذیڈنٹی قبول کیے رکھی ۔

جون ۱۹۳۶ء میں انٹر کالجئیٹ مسلم برادر ہڈ کے بعض اراکین حضرت علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔ ان کے سامنے سیاسی صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے حضرت علامہ نے فرمایا ''ہندی مسلمانوں کی یہ بڑی بد قسمتی ہے کہ آن کے اعلیٰ درجہ کے سیاسی دماغ یا تو حکومت کے کمپ میں ہیں یا وہ کانگرس سے منسلک ہو چکے ہیں ۔ ملت اسلامیہ قابل اعتماد قیادت کی رہنمائی سے محروم ہونے کے باعث آج چوراہے پر کھڑی ہے ۔ اس بظاہر مایوس کن ماحول میں اُمید کی ایک کرن مسٹر جناح کی شخصیت کی شکل میں نظر آتی ہے ۔ وہ ہندوستان میں واحد شخص ہیں ، جنھیں نہ تو ہندو خرید سکتا ہے اور نہ حکومت دبا سکتی ہے ۔ مسٹر جناح نے مرکزی اسمبلی میں (۷ فروری ۱۹۳۶ء) اپنے تدبر سے انگریزی حکومت اور کانگرسی اپوزیشن کے مابین مٹھی بھر مسلم اراکین کو پاسنگ کی حیثیت دے کر ایک طرف کمیونل اوارڈ کو منظور کروا لیا ہے اور دوسری طرف گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے ماتحت مجوزہ مرکزی فیڈریشن کا منصوبہ بھی مسترد کروا لیا ہے ۔ مسلمان نوجوان کا یہ فرض ہے کہ وہ ملی مفاد کے ایسے بے خوف اور با تدبیر نگہبان کی حمایت میں سرگرم عمل ہوں'' ۔ حضرت علامہ نے برادر ہڈ کے اراکین کو یہ مشورہ بھی دیا کہ وہ مسٹر جناح کی تائید میں ایک اخباری بیان جاری کریں ۔ حضرت علامہ نے فرمایا ''اس طرح یونی نسٹوں کو معلوم ہو جائے گا کہ مسلمانوں کی نئی نسل کس طرح سوچتی ہے ۔''

انٹر کالجئیٹ مسلم برادر ہڈ کے لیے ، جس نے اس سے پہلے اپنی تمام تر توجہ مسلمان طلبہ کی اخلاق اصلاح تک محدود کر رکھی تھی ، یہ ایک نیا میدان عمل تھا ۔ انھوں نے حضرت علامہ کے ارشاد کے مطابق مسلم لیگ کی حمایت میں بیان کا ایک مسودہ تیار کیا ، جسے ان کی منظوری حاصل کرنے کے بعد اخبارات میں شائع کر دیا گیا ۔ اس بیان کی اشاعت پر حضرت علامہ بہت مطمئن اور مسرور تھے برسبیل تذکرہ یہاں یہ کہنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ حضرت علامہ کے ارشاد کے ماتحت انٹر کالجئیٹ مُسلم برادرہڈ کے جن چند اراکین نے ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ کا جھنڈا اُٹھایا ، وہ مسلسل گیارہ سال تک عواقب و نتائج سے بے نیاز ہو کر قیام پاکستان تک اس جھنڈے کو تھامے رہے ۔ اس کے کچھ عرصہ بعد حضرت علامہ کے مشورہ سے پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا قیام عمل میں آیا جس نے قائد اعظم کا دست راست بن کر پنجاب میں یونی نسٹوں کی اینٹ سے اینٹ بجانے میں مدد دی ۔ فیڈریشن کے پہلے صدر حمید نظامی مرحوم اور دوسرے عہدےدار جب حضرت علامہ سے نو تشکیل شدہ جماعت کے لیے پیغام حاصل کرنے کے لیے ملے ، تو انھوں نے اپنے پیغام میں دوسرے امور کے علاوہ یہ بھی فرمایا

''طاقت حاصل کرنا بُری بات نہیں ، لیکن طاقت کا غلط استعمال کرنا شیطان کا کام ہوتا ہے۔''

حضرت علامہ فطرتاً یک سو اور یک دل انسان تھے ۔ منافقت اور مداہنت انھیں چھوتک نہ گئی تھیں ۔ ان کی بے باکی کا یہ عالم تھا کہ جب مسجد شہید گنج کے انہدام کے بعد ایک ڈیپوٹیشن ، جس میں بعض ایسے مسلمان زعماء بھی شامل تھے جو در پردہ انگریز گورنر کو مسلمان کی رائے عامہ کی پروا نہ کرنے کا مشورہ دیا کرتے تھے ، ان سے مشورہ کی غرض سے ان سے ملنے کے لیے آیا، تو انھوں نے بڑی بے تکلفی سے کہا ''بھئی یہ کیا غضب ہے کہ ایک طرف تو گرانے والوں کی پشت پناہی کرتے ہو اور دوسری طرف مجھ سے مسجد کی واگذاری کے لیے مشورہ طلب کرنے بھی آئے ہو پھر قرآن کریم کی ایک آیت پڑھی : واذا لقوالذین امنوا (بقرہ ۱۴) حضرت علامہ کے اس ارشاد کو سن کر بعض بڑے بڑے طرۃ بردار ماتھوں پر پسینہ آ گیا ۔ جب ایک دفعہ حضرت علامہ نے مسلم لیگ کی حمایت کا اعلان کر دیا تو وہ تمام لوگ جن کا تعلق مسلم لیگ کی مخالف جماعتوں سے تھا ، ان سے ایک ایک کر کے کٹ گئے ۔ ان میں کرسی نشین مدعیان قیادت کے علاوہ بڑائی کے دعوے دار بڑے بڑے اخبار نویس بھی شامل تھے ۔ حضرت علامہ کا تعلق صرف ان لوگوں سے رہ گیا جو مسلم لیگ کے ہم نوا تھے ۔ ان میں چند وکلا ایک دو سرکاری ملازم چند اخبار نویس ، چند اطبا اور چند علما تھے ، لیکن حضرت علامہ کو اس کا قطعاً ملال بلکہ خیال تک نہ تھا ۔

اخباروں میں روز نامہ ''احسان'' اور اخبار نویسوں میں مولٰنا مرتضیٰ احمد خاں مکیش کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس دور میں موخرالذکر کی وساطت سے مقدم الذکر میں حضرت علامہ کا سیاسی کلام ''ایکس شاعر'' کے قلمی نام سے شائع ہوا کرتا تھا ۔

ایک مرتبہ جناح سکندر پیکٹ کے بعد صوبہ کے چیف منسٹر سر سکندر حیات خان مرحوم علامہ کی عیادت کے لیے ''جاوید منزل'' آئے ۔ اس مختصر سی رسمی ملاقات میں علامہ تنبیہ سے باز نہ رہے ۔ سر سکندر حیات خاں کو مخاطب کر کے فرمایا'' سردار صاحب ! ہندوؤں اور سکھوں کو راضی کرنے کے لیے آپ جو چاہیں کریں ، لیکن ملت اسلامیہ کی سبکی مول نہ لیں'' ۔

مارچ ۱۹۳۶ع سے اوائل ۱۹۳۸ع تک دو سال کی مدت میں حضرت علامہ نے تین ہنگامہ خیز مباحث میں ایک فریق کی حیثیت میں حصہ لیا ۔ پہلے مباحثہ میں انھوں نے پنجاب کے گورنر سر ہربرٹ ایمرسن کو جنھوں نے ''انجمن حمایت اسلام''

لاہور کے پلیٹ فارم سے صوبائی خود مختاری سے کماحقہ فائدہ اٹھانے کے لیے مسلمانوں کو اپنی صفوں میں اتحاد قائم کرنے کی تلقین کی تھی ، ایک جوابی بیان کے ذریعے یہ کہہ کر بے نقاب کیا کہ مسلمانوں کے داخلی انتشار کا باعث تو خود گورنمنٹ ہے ، جس نے انھیں شہری اور دیہاتی کی مصنوعی تقسیم میں بانٹ رکھا ہے اسی بنا پر دیہاتی مسلمان نوکر شاہی کے مرغ دست آموز بن کر رہ گئے ہیں ۔

دوسرے تاریخی مباحثہ میں مولانا حسین احمد مدنی کے اس کلیہ کا ، کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں ، تار و پود اس مشہور قطعہ سے بکھیر دیا :

عجم ہنوز نہ داند رموز دین ورنہ
ز دیو بند حسین احمد این چہ بوالعجبیست
سرود برسر منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر زمقام محمد عربی است
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دین ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی ، تمام بولہبی است

تیسرا مباحثہ پنڈت جواہر لال نہرو کی جانب سے قادیانی فرقہ کو اسلام کا صحیح ترجمان قرار دینے کی تردید سے شروع ہوا حضرت علامہ نے اپنے مفصل بیانوں میں شرک فی النبوۃ کے عمرانی مقتضیات کی عصری اصطلاحات میں کھول کر وضاحت کی ۔ ایمان عقیدہ ختم نبوت کی عقلی توجیہہ تحریک پاکستان کے ارتقاء میں ایک بڑا سنگ میل ثابت ہوئی ۔ عام مسلمانوں کے دینی عقائد اور جدید سیاسی قومیت ، مملکت اور ہوم لینڈ کا باہمی ربط اس طرح واضح ہو گیا کہ مسلم عوام اور خواص دونوں پہلی مرتبہ مطالبہ پاکستان پر ہم‌نوا ہی نہیں یک دل بھی ہو گئے ۔

ان ہنگامہ خیز بحثوں کے ساتھ انھی دو سالوں میں ارمغان حجاز کی بیشتر نظمیں بھی زیور تخلیق سے آراستہ ہوئیں ۔ دراصل جیسا کہ علامہ نے خود فرمایا ہے ''ان کا پیکر خاکی دو روحوں کا نشیمن تھا ، ایک سراپا سوز و مستی اور دوسری سراپا تاب و تب تھی'' ۔ سوز و مستی والی روح جھکڑ چلے یا آندھی آئے ، اولے برسیں یا طوفان اٹھیں ، اپنے کام میں مصروف رہتی تھی ۔ ایک دن ان کے ایک بے تکلف دوست سردار امراؤ سنگھ مجیٹھیہ ملنے آئے ، تو شروع گفتگو میں سردار صاحب انگریزی میں پوچھنے لگے ۔

How is the Muse ?

اس پر حضرت علامہ نے حقہ کا کش بھرتے ہوئے فرمایا ''ایہہ شاعری پری نہیں ، اک ڈاہڈا جنّ اے ، جھدی اک فرمائش پوری کرو ، تاں دوسری

فرمائش لے کے چمڑ جاندا اے ، مینوں تے ایہدے کولوں پچھا چھڈاناں محال ہو گیا اے ۔''

والدہ جاوید کے انتقال کے بعد گھر کی نگھبانی اور کم‌سن جاوید اور منیرہ کی بہ نفس نفیس خبرگیری کے مسائل حضرت علامہ کے لیے خاصہ پریشان کن تھے ۔ علی بخش کے علاوہ رحمان اور مسیتا دو اور ملازم تھے ، مسیتا باورچی تھا ۔ حضرت علامہ فرمایا کرتے تھے کہ جب مسیتا مجھ سے صبح آ کر یہ پوچھتا ہے کہ آج کیا پکے گا ؟ تو مجھے سخت ذہنی آلجن کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ آج مجھے کیا کھانا چاہیے ؟ کچھ عرصہ تک گھر کا انتظام حضرت علامہ کے ایک بھتیجے اور ان کی بیوی کے زیر اہتمام لشتم پشتم چلتا رہا ، لیکن جب گھر کا بوجھ بڑھنے لگا تو حضرت علامہ نے علی گڑھ میں اپنے ایک دوست رشید احمد صدیقی کو خط لکھ کر تاکید کی کہ وہ اس جرمن خاتون کو جو کہ وہاں اپنی شادی شدہ بہن کے ہاں مقیم تھیں ، لاہور آنے کے لیے آمادہ کریں تا کہ وہ گھر کی خبرگیری کے علاوہ جاوید اور منیرہ کی دیکھ بھال بھی کر سکیں ۔ حضرت علامہ جرمن قوم کے بڑے مداح تھے ۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ کھری ہڈی کے لوگ ہیں ۔ چنانچہ جب ۱۹۳۷ء کے موسم گرما میں مس ڈورالنٹ ویٹر نے ''جاوید منزل'' کا چارج لیا تو حضرت علامہ گھر کے روزانہ کے انتظامات سے بڑی حد تک بے فکر ہو گئے ۔ اس جرمن خاتون نے نہ صرف حضرت علامہ کی توقعات کے مطابق جاوید خصوصاً منیرہ کے دلوں میں امی کے مقام کی خلا پُر کر لی بلکہ اپنے حسن انتظام اور سلیقہ شعاری سے گھر کے اخراجات میں معتدبہ کفایت کے ساتھ بہتر خانہ داری کا نمونہ بھی پیش کیا ۔ یہ خاتون جو ان دنوں مغربی جرمنی میں مقیم ہیں ، جاوید منزل میں قیام کے دوران حضرت علامہ کے حسن سلوک سے اس حد تک متاثر ہیں کہ جاوید اور منیرہ کو دیکھنے کے لیے ہر سال پاکستان آتی ہیں ۔ اس معمول کے مطابق گذشتہ سال جب وہ ''جاوید منزل'' میں فروکش تھیں اور انھوں نے علامہ اقبال کے پوتے ''منیب اقبال'' کو اپنی گود میں لے رکھا تھا تو ان کے چہرے کی کیفیت دیدنی تھی ۔

۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کی تمام شب میں حضرت علامہ کے بستر مرگ کے نزدیک حاضر رہا ، میں نے پانچ بجے صبح حالت نزع کا بھی مشاہدہ کیا ۔ دم مرگ وہ خود اپنے اس شعر کا مجسم مرقع تھے کہ :
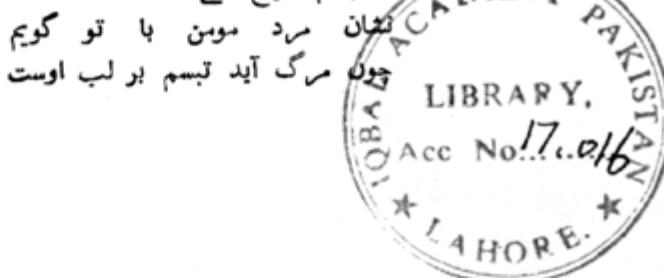
نشان مرد مومن با تو گویم
چوں مرگ آید تبسم بر لب اوست

IQBAL REVIEW

Journal of the Iqbal Academy, Pakistan

This Journal is devoted to research studies on the life, poetry and thought of Iqbal and on those branches of learning in which he was interested: Islamics, Philosophy, History, Sociology, Comparative Religion, Literature, Art, Archaeology, etc., etc.

Published alternately

in

English and Urdu

Subscription

(for four issues)

Pakistan		Foreign countries
Rs. 12.00		30s or $4.00
	Price per copy	
Rs. 3.00		8s or $1.00

All contributions should be addressed to the Editor, Iqbal Review, 43-6/D, Block No. 6, P.E.C.H. Society, Karachi—29. The Academy is not responsible for loss of any article in any manner whatsoever. No articles are returned unless accompanied with a stamped envelope.

Publishd by Mr. B.A. Dar, Director, Iqbal Academy, Pakistan, Karachi
Printed at Technical Printers, Karachi.